نقشِ فرنگ

یعنی

اقصائے مغرب کی سیر کے دلاویز تاثرات

دیار فرنگ کی سیاحت اور مدبرین مغربی کے ساتھ مبادلۂ خیالات

چند دلکش اشارات

از

جناب قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر جمہور و صباح

۱۹۲۴ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

بار اول ۱۰۰۰

قیمت عہ

نذر عقیدت

جس طرح ایک خالی خوان کی بے مائگی کو چھپانے کے لئے اُس پر ایک زرکار
خوان پوش ڈال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اِن اوراق پریشان کی عیب پوشی کے
لئے میں ایک نسبت بزرگ ڈھونڈتا ہوں +

عمر کے بہترین پندرہ برس اخبار نویسی کے اِس عہد میں گزرے جو ہندوستان
کی قومی زندگی کا ایک متلاطم اور یادگار عہد تھا۔ جب قومی خادموں کا امروز
ان کے فردا سے ہمیشہ ناآشنا ہوتا تھا۔ جب زندگی کا طور یوں تھا۔ کہ صبح کو گھر
سے چلے تو شام کو جیل خانے پہنچ گئے + اُس زمانہ میں قلم ٹوٹا نہ تھا۔ بُرا لکھا۔
مگر بہت کچھ لکھا۔ لیکن قومی دریا کی دھار پر یہ سب کاغذ کی کشتیاں تھیں۔ جو بہتی
ہوئی نکل گئیں۔ کوئی ایک نقش بھی ایسا نہ تھا۔ کہ باقی رہ جاتا۔ بدنصیبی سے نہ کبھی
اتنی توفیق حاصل ہوئی۔ نہ اہلیت نصیب کہ اِن کاغذ کی ناؤں کے علاوہ چند باقی
رہنے والے اوراق بھی مرتب ہوتے۔ ہر صبح کو جو کچھ اخبار کے صفحات پر تھوپا وہ سب
شام کو غریب عطار اور پنساری کے کام آیا۔ ۱۵ برس کی اخبار نویسی کی یہ ساری
روئیداد ہے! ارادے کتنے بھی تو پورے نہ ہوئے کسی مستقل تصنیف و تالیف
کی صورت میں اپنے وطن کی کوئی خدمت کرنی چاہی تو بن نہ آئی۔ یا زمانہ نے
مہلت نہ دی۔ یا اس میدان میں قدم رکھنے کی ہمت نہ ہوئی یا اُس بازار میں جانے

شرم آتی۔ جہاں ناولوں اور عاشقانہ افسانوں کے اوراق کا انبار ترازو میں تلکر یا گڈیوں اور جزوں کے حساب سے گن کر فروخت ہوتا ہے!

یہ نام نہاد سفرنامہ جو محض سرسری مشاہدات کا ایک عکس ہے۔ میرے اوراق پریشان کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو کتاب کی صورت میں شایع ہوتا ہے۔ اور وہ بھی محض اس لئے کہ زبردستی ان متفرق اوراق کو ردی سے نکالا گیا۔ یہ استحصال بالجبر ایک ایسے عزیز کا کام ہے۔ جنکے خلاف میری محبت مرافعہ بھی نہیں کر سکتی +

اب کہ یہ اوراق ملک کے سامنے جاتے ہیں۔ انکی اور میری بے بضاعتی کا پردہ دار صرف **مسیح الملک** کا نام ہے۔ اور میں اپنی تمامتر عقیدت و نیازمندی کے ساتھ چاہتا ہوں۔ کہ یہ ہدیہ حقیر اس شخص کے نام سے نسبت حاصل کرے۔ جس کا فیض صحبت میری زندگی کا چراغ ہے۔ کون جان سکتا ہے۔ کہ میں نے **حکیم اجمل خاں** کی پاکیزہ صحبتوں میں کیا کچھ سیکھا۔ اور کیا کچھ پایا +

کہئیے کیا۔ کہ میری زندگی کا سرمایہ بہت قلیل ہے۔ ورنہ یہ عزت تو ہندوستان کے آیندہ مورخ ہی کو ملنی چاہئے۔ کہ اسکی مرتبہ تاریخ آزادئ ہندوستان کا سرورق مسیح الملک کے نام سے مزین ہو۔ میری قلم کے بھونڈے نقوش اور میرے دماغ کے نتایج پریشان اس نام کی عظمت سے بہت دُور ہیں!

تاہم نیازمندوں کو جو ایک ناز نیازمندی ہوتا ہے۔ اسی نے مجھے بھی اتنی جُرأت دلائی۔ کہ میرے ناظرین ان اوراق کو مسیح الملک کے نام نامی سے منسوب پاتے ہیں +

مئی سنہ ۱۹۲۳ء عبد الغفار

پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے!

گذشتہ سال موسم گرما میں یورپ سے واپس آنے کے بعد چند ہفتے بمقام سولن جناب قبلہ مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب کی پاکیزہ اور دلفریب صحبت میں گزرے۔ اُن ہی چند ہفتوں میں یہ اوراق مرتب کئے گئے۔ مگر ان کی تکمیل نہ ہو سکی۔ اور دُنیا کے مکروہات نے پھر وہ سکونِ قلب حاصل نہ ہونے دیا۔ جو اب زندگی کے بازار میں میرے لئے بہت کم یاب ہے۔ کبھی چند لمحے ایسے نصیب نہ ہوئے۔ کہ دماغ وقلم میں یک گونہ آشتی ہوا اور بہت سی کشاکش کے بعد بھی کاغذ پر چند نقوش مترتب ہو سکیں۔ ورنہ اب تو ہمدرد و جمہور و صباح کے بعد یہ شیشہ خالی ہے۔ یا اس شراب میں کیف نہیں! طبیعت میں ایک انقلاب ہے۔ انقلاب نہیں۔ ایک نا قابل بیان اضمحلال ہے۔ اس شکستگی کی داستان بہت طویل ہے۔ اور ان صفحات پر خارج از بحث۔ غالب مغفور نے "داغِ فراق صحبت شب۔ اور شمع کی خموشی پر آنسو بہائے تھے۔ مجھ سے ہو سکتا تو میں خود اپنا ایک نوحہ لکھتا۔ ایک دفعہ خود اپنا کفن سیتا۔ اور خود ہی اپنے جنازہ کو کاندھا دیتا!

قصہ مختصر یہ اوراق ہنوز مکمل نہ ہونے پائے تھے۔ کہ مجھے پھر ایک دفعہ یورپ کا سفر پیش آیا۔ ۲۲ مئی ۱۹۲۲ء کو یہ دوسرا سفر شروع ہوا۔ چلتے چلتے احباب

سے وعدہ کیا تھا۔ کہ جس طرح ہو سکے گا۔ سمندر کے اس دوسرے سفر میں کم از کم پہلے سفر کی داستان تو مکمل کر دونگا جبدن بمبئی سے روانہ ہوا۔ اُسی دن سے اس وعدہ کا بہت خیال تھا۔ اور بُرا بھلا جو کچھ ہو سکا لکھتا رہا۔ آخر بمشکل آج ٹھیک اسی وقت جب کہ ہمارا جہاز جزیرہ کریٹ کے سامنے گزر رہا ہے۔ میں یہ آخری سطور لکھ رہا ہوں۔ تاکہ فرانس پہنچتے ہی ان تمام اوراق کو ہندوستان روانہ کر دوں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ اس داستان کی اشاعت میں بہت دیر ہوئی۔ مضامین کی ترتیب نہایت خراب ہے۔ مطالب بھی اس طرح ادا نہ ہوئے۔ جس طرح میں ادا کرنا چاہتا تھا عجلت اور اختصار کے خیال سے بہت سے اجزا جو پہلے شامل کرنا چاہتا تھا۔ اب نظر انداز کرنے پڑے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو تصویر میں ان اوراق میں کھینچنا چاہتا تھا وہ نہ کھینچ سکا۔ یہ جو کچھ ہے میرے تخیل کا ایک دہندلا سا عکس بھی نہیں محض احباب کا اصرار مجھے اس ردی کے شایع کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر لوگ ان صفحات کو پڑھیں یا اگر یہ داستان عام طور پر مقبول ہو تو یہ واقعہ میرے لئے تعجب انگیز نہ ہوگا۔ وہ جو ایک خیال تھا۔ کہ یہ سفرنامہ کوئی نئی چیز ہو اور اچھی چیز ہو۔ وہ سب چند صفحات لکھنے کے بعد ہی خاک میں مل گیا تھا۔ اب یہ کشکول چند سوکھے ٹکڑوں سے بھرا ہُوا ہے۔ جو ادھر اُدھر سے جمع کر لئے گئے ہیں۔ جو دستر خوان بچھانا چاہتا تھا۔ وہ خالی ہے! اپنی بے مائیگی کے اس اعتراف کے بعد اور کیا لکھوں؟

عبدالغفار

۴ جون سنہ ۱۹۲۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید کلام

یورپ میں ہمارا کم وبیش ڈھائی ماہ کا سفر ۳۰ تاریخ کو جب ہم مارسیلز سے جہاز پر سوار ہو کر عازم وطن ہوئے ختم ہو گیا۔ آج دو دن ہوئے۔ کہ میں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری پی اینڈ او کمپنی کے جہاز کیلنڈونیا پر سوار ہیں۔ ہر ساعت جو گزرتی ہے وطن سے قریب تر پہنچا رہی ہے۔ ہر روز یورپ دُور ہوتا جاتا ہے۔ الحمد للہ!

جب میں ہندوستان سے روانہ ہُوا تھا۔ تو دوستوں نے چلتے چلتے تاکید کر دی تھی۔ کہ جو کچھ دیکھوں قلمبند کرتا جاؤں۔ اور احباب کے لئے کوئی سوغات نہ لاؤں۔ تو کم از کم ایک سفرنامہ تو مرتب ہو جائے۔ وعدے تو سب کچھ کر لئے تھے۔ مگر اس تین ماہ میں چند صفحات سے زیادہ کچھ نہ لکھ سکا۔ کچھ تو وفد کے متعلق اپنے فرائض اور کچھ انگلستان و یورپ کے حالات سے دماغ کی بے لطفی و پراگندگی۔ غرض ایک معمولی یادداشت بھی مرتب نہ ہو سکی۔ اب جو لکھنے

بیٹھا ہوں تو اس مسودہ کی ایک ایک سطر کٹھن ہے۔ دماغ میں اس سفر کے متعلق
شاید چند ہی اجزائے پریشان محفوظ ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں۔ کہ
اُن کی شیرازہ بندی کر دوں!

پڑھنے والے اِن اوراق کو سفرنامہ تصور نہ کریں۔ ورنہ مایوس ہونا پڑے گا۔
نہ یہ چھوٹی سی کتاب اس غرض سے مرتب کی جاتی ہے۔ کہ آیندہ یورپ کے
جانے والوں کو جہاز کا کرایہ ٹھہرنے کے لئے ہوٹل۔ سیر و سیاحت کے لئے
مشہور مقامات کا حال معلوم ہو۔ اگر پڑھنے والوں نے ان اوراق کا مفہوم یوں
سمجھا تو میرا مقصود حاصل نہ ہوگا۔ اور محنت اکارت جائے گی۔

چند الفاظ میں بتا دوں کہ کیا لکھ رہا ہوں۔ اور کیوں لکھ رہا ہوں۔ حقیقت
یہ ہے۔ کہ اِن اوراق کے اندر ایک شخص واحد کے دماغ و دل کی اُن کیفیات
کا پرتو ہے۔ جو انگلستان۔ فرانس۔ سوئٹزرلینڈ و اٹلی کے مناظر کو ایک نظر دیکھتا
ہُوا گزر گیا۔ اور جس نے اِن ممالک میں کہیں کہیں یورپ کی قومی زندگی کے
نور و ظلمت کو بھی دیکھ لیا۔ بس۔ یہ سطور جس نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ وہ ایک
معمولی حیثیت کے مسلمان اور ایشیا نژاد کا نقطہ نظر ہے۔ لکھنے والا تین مہینہ
تک یورپ میں پھرتا رہا۔ لیکن ہر قدم پر اُس کے مشاہدات خالص ایشیائی
نقطہ نظر پر مبنی رہے۔ جس چیز پر اس کی نظر گئی معاً اس کے ایشیائی تخیل نے
اُس چیز کو مشرقی معیار پر کس لیا۔ اور اس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے
مغربی تخیل کا (جہاں تک سمجھ میں آسکا) مشرقی تخیل میں ترجمہ کر دیا۔ اگر میں
کوئی سفرنامہ یا اس سفر کا روزنامچہ لکھتا۔ تو وہ ایک دوسری اور میرے خیال
میں کمتر چیز ہوتی۔ یہ سب باتیں تو ٹامس کک کمپنی کے دفتر میں معلوم کی جا سکتی
ہیں۔ یہ نہیں۔ کہ میں نے ہر ملک کے مشہور مقامات کو دیکھنے کی کوشش نہ کی

ہو۔ مگر فرق یہ ہے۔ کہ میں در و دیوار ونقش ونگار کے حالات بیان کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ یورپین زندگی کا جو نقشہ میں نے دیکھا۔ اس کے متعلق اپنے خیالات کو ضبط تحریر میں لانا چاہتا ہوں۔ آثار قدیمہ۔ ہوٹل۔ قہوہ خانے۔ ناچ گھر۔ رقص و سرود کے ہنگامے۔ تھیٹروں کے رنگینیاں باغوں کی صحبتیں۔ ہوٹلوں کی زندگی کے تماشا ہائے خفی وجلی۔ و دیگر لوازم تعیش۔ پھر ارزاں معصیت اور ارزاں تر اخلاق انسانی۔ گراں ضروریات زندگی۔ اور گراں تر خصائل انسانیت۔ محدود جغرافئی قومیت کا تخیل اور وہ کورانہ قدامت پسندی جس کو آزاد خیالی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پھر اس قدامت پسندی کے چپ و راست تعصبات رنگ و نسل۔ یہ سب کچھ دیکھا۔ لیکن بتانا صرف یہ ہے۔ کہ ایک کالے رنگ کا انسان گورے ملکوں کی اس زندگی سے کس طرح متاثر ہوا۔ ہر سطر جو ان اوراق میں آپ پڑھیں۔ اسی اصول کے ماتحت ہے۔ اور میں چاہتا ہوں۔ کہ ان سطور کے لکھنے والے کو نہ جہاں گرد سیاح سمجھا جائے۔ نہ پُرگو اور ہمہ داں مصنف تصور کیا جائے۔ نہ معاملہ فہم ماہر سیاست یا زمانہ شناس مدبر قرار دیا جائے۔ بلکہ صرف یہ سمجھ لیا جائے۔ کہ ایک شخص واحد جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ اور سن شعور کو پہنچا۔ جس نے ہندوستانی اور مسلمان ماں باپ کے آغوش میں پرورش پائی۔ اور اپنی ہندوستانی سوسائٹی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ پھر عمر کے تقریباً ۲۷ سال اسی بدنصیب ملک میں۔ اور اخلاقی پستی اور سیاسی غلامی و مجبوری کی اسی حالت میں گزارے جو اس ملک کے چپہ چپہ پہ ہویدا ہے۔ وہ شخص واحد تین مہینہ کے لیئے یورپین ممالک اور مغربی تہذیب کے چند سرسری نظارے دیکھتا ہے۔ جن سے اس کا ایشیائی تخیل متاثر ہوتا ہے۔ اور اس طرح جو نقوش اس کے دماغ پر مترتب ہوتے ہیں۔ ان کو وہ بقدر اہلیت اپنے ملک کے سامنے

پیش کرتا ہے۔ شاید کہ سمجھنے والے اِن الفاظ کے اندر کوئی نقش عبرت بھی دیکھ سکیں۔ اِن اوراق کی ایک سطر بھی اگر میرے ملکی اور مذہبی بھائیوں کو مشرق و مغرب کے "تفاوت راہ" کی طرف یک گونہ متوجہ کر دے۔ تو میں سمجھونگا کہ میرا قلم کامران اور میرا مقصود حاصل ہے +

ایک بات اور عرض کر دوں۔ چونکہ میں دوسرے وفد خلافت کے سکرٹری کی حیثیت سے گیا تھا۔ اور نیز چونکہ ملک میں وفد کے متعلق بعض غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جن کا کافی جواب نہیں دیا گیا۔ اس لئے میں نے قیام انگلستان کا ذکر کرتے ہوئے ضروری سمجھا تھا۔ کہ وفد کے متعلق تمام ضروری امور کو حوالہ قلم کر دوں۔ چنانچہ اِن اوراق کا ایک جُزو وفد کے حالات اور اُن حالات کے سلسلہ میں بعض ضروری کاغذات کی نقول کے لئے مخصوص کرنا پڑا تھا۔ لیکن وہ وقت گزر گیا۔ کچھ میرا تساہل کچھ زندگی کے مکروہات۔ کچھ سیاسی مشاغل کی دوا دوش۔ غرض دو برس ہو گئے۔ اور یہ مسودہ ایک طرف پڑا رہا۔ اب وفد کے متعلق ان صفحات کے متفرق اجزا کو دیکھتا ہوں۔ تو وہ بہت بعد از وقت ہیں۔ اور اس دو برس میں دُنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ حتیٰ کہ میں خود اپنے وجود کو پسماندہ پاتا ہوں۔ قافلہ کہیں سے کہیں پہنچا۔ اب اُس گرد کاروان کا پریشان کرنا فضول ہے۔ جب کبھی قومی تحریکات کی کوئی تاریخ لکھی جائے گی۔ تو ہم غریبوں کی وہ تمام جبہہ سائی بھی مورخ بیان کرے گا۔ جس کے نشان ابھی پیشانیوں پر موجود ہیں! ہر سجدہ جو ہمنے ان بند دروازوں پر کیا ہے۔ لکھا جائے گا۔ ہر ٹھوکر جو ہمنے اُونچی اُونچی دہلیزوں پر کھائی ہے بیان ہوگی۔ اور ہر وہ مشت خاک جو آنکھوں میں جھونکی گئی ہے۔ کاغذ کے صفحات پر پھیلائی جائیگی۔ اُس وقت تک اِن صفحات میں یورپ کی عام زندگی کے چند تماشے دیکھ لیجے اور کچھ نہ دیکھئے + عبدالغفار۔ اپریل ۲۲ء

دعوت

مولانا محمد علی اور دیگر اراکین وفد خلافت کی واپسی کے بعد ہر شخص نے یہ سمجھ لیا تھا۔ کہ جہاں تک اہل برطانیہ اور برطانوی وزرا کا تعلق ہے۔ مسلمانان ہندوستان نے آخری حجت پیش کر دی۔ اس کے بعد عرض و معروض اور دلایل و براہین کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ ہم نے اپنے بہترین ترجمان ان کی خدمت میں بھیج دیئے۔ کوئی پہلو نہ تھا۔ جو پیش نہ کیا گیا ہو۔ کوئی بحث نہ تھی۔ جو نہ اُٹھائی گئی ہو۔ کوئی دلیل نہ تھی۔ جو مطالبہ حق و انصاف میں برروے کار نہ لائی گئی ہو۔ وزیر اعظم و دیگر وزرا کو ان کے وعدے یاد دلائے گئے۔ اخبارات اور عام جلسوں کے ذریعہ سے مطالبہ حق و انصاف کی راہ میں جو سعی ممکن تھی کی گئی۔ کوئی دروازہ باقی نہ تھا جس پر جا کر عرض حال نہ کیا ہو۔ اس سعی بے حاصل میں وقت اور روپیہ ضایع کرنے کے بعد کیا تعجب ہے۔ اگر مسلمانان ہند اور ان کے برادران وطن نے یہ سمجھ لیا۔ کہ اب کشود کار کے یہ ذرایع بے سود ہیں ؎

بالآخر ہم اُس منزل سے گزر گئے۔ جہاں انصاف و حق کا نام لے کر گدایانہ ہاتھ پھیلایا جاتا ہے۔ پس کسی دوسرے وفد کا بھیجا جانا خیال و گمان سے بھی باہر تھا۔ لیکن انگلستان کے خداوندان تدبیر اُن کاغذ کے پرزوں کو لئے بیٹھے تھے۔

جن کا نام عہدنامہ سیوری ہے۔ اور نہیں جانتے تھے۔ کہ کس طرح مصطفےٰ کمال اور قوم پرست ترکوں کو اس گولی کے نگلنے پر مجبور کریں۔ وہی "باغی" اور "سرکش" لیڈرے جواب انگورا میں ملت عثمانی کا جھنڈا بلند کر چکے تھے۔ نوازے جا رہے تھے۔ چند ہفتے پہلے جس اسلامی جمہوریت کے وجود کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کیا گیا تھا۔ اُسی کے نمایندے لندن میں مدعو کئے جا چکے تھے۔ اور اب کوشش ہو رہی تھی۔ کہ طوفانی سمندر پر تیل ڈالا جائے۔ شاید شاطران سیاست کی اس چال میں ہندوستان کے چند نام نہاد نمایندوں کو بھی شریک کرنا ضرور تھا۔ اور اس لئے چند مخصوص اشخاص اُس دعوت سے سرفراز کئے گئے۔ جس کی نوعیت کا علم اگر ہو تو شاید ہز ہائینس سر آغا خاں یا مسٹر سید حسن امام کو ہو ہمیں تو یکسر نہ تھا۔ خصوصاً خادمان خلافت تو اس آنے والی دعوت اور نصیب ہونے والی عزت سے بالکل ہی بے خبر بیٹھے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے تک خود صدر خلافت کمیٹی کو پتہ نہ تھا۔ کہ اُن پر بارگاہ وزارت عظمےٰ کا یہ سمن تعمیل ہونے والا ہے +

میں اُس زمانہ میں دہلی میں موجود تھا۔ اور مہاتما گاندھی کے علاوہ دیگر اکابرین قوم بھی وہاں جمع تھے۔ ۱۵ فروری کی شام کو ڈاکٹر انصاری صاحب نے مجھے بلایا ان کے یہاں پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ صبح سیٹھ چھوٹانی صاحب کا ایک تار مہاتما جی کے پاس آیا تھا۔ جس میں سیٹھ صاحب موصوف نے لکھا تھا۔ کہ ان کو گورنمنٹ بمبئی کے ذریعہ سے وزیر اعظم نے لندن طلب کیا ہے۔ تاکہ خلافت اور مسئلہ شرقیہ کے متعلق جو معاملات سپریم کونسل کے سامنے پیش ہیں۔ اُن کی نسبت کچھ مشورہ (مشورہ! اللہ رے نصیب!) کریں۔ سیٹھ صاحب نے مہاتما جی سے دریافت کیا تھا۔ کہ ان کو کیا کرنا چاہئے۔ مہاتما گاندھی کا جواب صاف اور مختصر مگر قطعی یہ تھا۔ کہ سیٹھ صاحب کو جانا چاہئے۔ مگر ڈاکٹر انصاری صاحب کو بحیثیت مشیر و ترجمان

ساتھ لینا چاہئے۔ اس عرصہ میں ہر طرف تار دوڑ رہے تھے۔ اور اکابرین قوم جلد جلد بمبئی جا رہے تھے۔ کہ وہاں ایک جگہ بیٹھ کر مشورہ کیا جائے۔ ابھی تک کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ سیٹھ صاحب کے علاوہ کس کس کو طلب کیا گیا ہے۔ تاہم جو لوگ مسٹر لائڈ جارج کے ادا شناس ہیں۔ ان کو یہ خیال پیدا ہوا تھا۔ کہ خلافت کمیٹی کے صدر کے علاوہ بھی چند اصحاب بلائے گئے ہوں گے۔ تاکہ برطانوی وزیر اعظم کے ترازو کے پلے اس کی خواہش کے خلاف نہ جھکنے پائیں۔ چونکہ وقت کم تھا۔ اور تاکید یہ تھی۔ کہ سیٹھ صاحب کو پہلے جہاز سے جو ۱۹ فروری کو روانہ ہوتا تھا۔ عازم انگلستان ہونا چاہئے۔ اس لئے برقی رسل و رسایل اور ہوائی مشوروں سے قطع نظر کرکے یہ طے پایا۔ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب اور جناب حکیم اجمل خاں صاحب فوراً بمبئی تشریف لے جائیں۔ اور آخری فیصلہ وہیں جا کر ہو۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کی تجویز کے مطابق یہ بھی قرار پایا۔ کہ میں ان شاہی مہمانوں کے ہمرکاب جاؤں۔ (شاید کہ اس حج اکبر کا تھوڑا ثواب میرے حصے میں بھی آئے!) اکثر احباب کا بھی یہ خیال تھا۔ کہ میرا جانا موجودہ حالات میں ہر طرح مناسب ہوگا۔ اسی زمانہ میں حکومت دہلی کی توجہات نے مجھے اخبار صباح کے ترددات سے یک گونہ فارغ کر دیا تھا۔ چنانچہ میں نے بمبئی جانے کا ارادہ تو کر دیا۔ لیکن اپنے سفر انگلستان کا فیصلہ بمبئی پہنچنے تک ملتوی رکھا۔ تاکہ جو اصحاب وہاں پہنچ جائیں۔ ان ہی کے مشورہ پر میرے جانے کا انحصار ہو۔ ۱۵ تاریخ کی شب کو میں وطن آیا۔ اور جناب حکیم صاحب و ڈاکٹر صاحب ۱۶ کی صبح کو بمبئی روانہ ہو گئے۔ دن بھر وطن میں رہ کر میں ۱۶ کی شب میں روانہ ہو گیا۔ احباب و اعزا کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ خود اپنے اہل و عیال کو بھی نہ بتا سکا۔ کہ مجھے اس قدر طویل سفر درپیش ہے۔ ۱۸ تاریخ کی سہ پہر کو بمبئی پہنچا۔ اور اسٹیشن پر معلوم ہوا۔ کہ میرا

جانا طے پایا ہے۔ اور صبح کو ۹ بجے جہاز پر سوار ہو جانا ہے!
لوگ سفر انگلستان کی تیاریاں ہفتوں اور مہینوں پہلے کرتے ہیں۔ کم از کم اپنے اہل و عیال سے رخصت ہوتے ہیں۔ اپنے کاروبار کا کوئی انتظام کرتے ہیں۔ یہاں خانہ بدوشی کا یہ عالم تھا۔ کہ ۱۹ کی صبح کو روانہ ہوئے۔ اور ۱۸ کی شام تک یہ بھی خبر نہ تھی۔ کہ صبح ہندوستان سے رخصت ہونا ہے۔ اس سفر ناگہاں کا لطف ہی کچھ اور تھا! جہاز پر سوار ہو جانے کے بعد اہل و عیال کو بذریعہ تار اطلاع دی گئی۔ کہ میں روانہ ہو گیا! سفر انگلستان کی یہ بے اختیاری و بے سروسامانی ہمیشہ یاد رہے گی۔ نظر غور سے دیکھئے۔ تو واقعی ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کا یہ عہد بھی یاد رہے گا۔ کہ جب لوگوں کو طویل سے طویل سفر کے لئے کمر تک باندھنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ اور پہلے اس سے کہ مسافر اپنے سفر کے اوقات طے کرے۔ دفعتاً رونما ہونے والے واقعات کا ایک بگولہ اُٹھتا تھا۔ اور اُس کو ہندوستان کے ساحل سے اُٹھا کر انگلستان کے ساحل پر رکھ دیتا تھا۔ مورخ جب اس عہد کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا۔ تو اس قسم کے واقعات میں اُس کو ہندوستان کی سیاسی زندگی کا ایک ایسا پہلو نظر آئے گا۔ جو کشاکش حیات کے اُن ہنگاموں پر روشنی ڈالے گا۔ جن میں یہ براعظم آج مبتلا ہے!

وفد کی نوعیت

مجھے تو بمبئی پہنچ کر معلوم ہُوا۔ کہ سیٹھ چھوٹانی صاحب کے علاوہ ہز ہائینس آغاخان اور مسٹر سید حسن امام بھی طلبیدہ جا رہے ہیں۔ پھر جہاز پر سوار ہوتے وقت دیکھا۔ کہ مشیر حسین قدوائی صاحب بھی رفیق سفر ہیں! اس طرح ۶۔ اشخاص

کی یہ ایک چھوٹی سی جماعت ایک ہی غرض کے لئے آمادۂ سفر نظر آئی۔ اس معجون
مرکب نے اصطلاح عام میں ایک وفد کی صورت اختیار کر لی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے
کہ اس جماعت کو کسی طرح بھی وفد خلافت کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔
اوّل تو یہ تمام اصحاب وزیر اعظم کے طلبیدہ تھے۔ اور کسی حالت میں ان کو ہندوستان
کا قائم مقام نہیں کہا جا سکتا۔ نہ خلافت کمیٹی نے کسی وفد کے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا
علاوہ بریں عامۃ الناس نے تو نہ صرف ان میں سے کسی کو اپنا نمایندہ قرار نہیں
دیا تھا۔ بلکہ صاف طور پر بعض اصحاب کے متعلق اپنی بے اطمینانی ظاہر کی تھی
جاتے وقت یہ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ کس غرض سے بُلائے گئے ہیں اور انگلستان
میں کیا کام کرنا ہوگا۔ خیال یہ تھا۔ کہ شاید سپریم کونسل کے سامنے پیش کئے
جائیں۔ مگر انگلستان جا کر سپریم کونسل تو کُجا خود وزیر اعظم تک بھی باریابی دشوار
ہوئی۔ غرض یہ قافلہ جو کچھ بھی ہو وفد خلافت تو ہرگز نہ تھا۔ خود بمبئی میں جب یہ
معلوم ہوا۔ کہ ہز ہائینس آغا خان اور مسٹر حسن امام بھی جا رہے ہیں تو بعض اراکین
خلافت کمیٹی نے صاف طور پر یہ رائے دی۔ کہ سیٹھ چھوٹانی و دیگر اراکین خلافت
کمیٹی کا ایسی حالت میں انگلستان جانا بے کار ہوگا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ ان اصحاب کے
طلب کرنے سے ہوا کا رُخ ظاہر ہوتا ہے۔ اور بہت ممکن ہے۔ کہ خادمان خلافت
اور ان حضرات کے درمیان جو اصولی اختلافات موجود ہیں۔ اُن سے وزیر اعظم
ناجائز فایدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں مسٹر حسن امام بلحاظ اپنی اعلیٰ شہرت
وقابلیت کے ایک قابل احترام شخصیت رکھتے ہیں ہندوستانی سیاسیات کے
گذشتہ دور میں ان کا پایہ بلند تھا۔ اتنا بلند تھا۔ کہ ایک سال کانگریس کے صدر
بھی منتخب ہو گئے تھے۔ لیکن یہ وہ زمانہ نہ تھا۔ جب ہنوز اعتدال و احتیاط و
مصلحت وقت کے بلند میناروں پر بابو سریندر ناتھ بینرجی اور فیروز شاہ مہتا

کے جھنڈے اُڑ رہے تھے پچھلی صفوں کے سپاہی آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ اور اگلی صفوں کے سورما ان کے سامنے دیوار کی طرح کھڑے تھے۔ لیکن زمانہ پچھلی صفوں کو آگے بڑھا لے گیا۔ اور اگلی صفوں والے پیچھے رہ گئے۔ مسٹر حسن امام اُسی پیچھے رہ جانے والی صف اوّل کے "آزمودہ کار" ہیں۔ ان کی قومی زندگی کے ساتھ جو روایات وابستہ ہیں۔ وہ ایسی نہ تھیں۔ کہ عہد نو کے کام کرنے والوں کو سید صاحب کی رائے پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار کرتیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہز ہائنس آغاخان کی شخصیت بہت زیادہ دلکش اور دلچسپ اور دلربا ہے۔ مگر وہ بھی باوجود اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کے سوئٹزرلینڈ و اٹلی کی پر فضا وادیوں اور جھیلوں اور پیرس و لندن کی گوناگون دلچسپیوں میں ہندوستانی سیاسیات کے مدوجزر کو بظاہر بھول چکے ہیں۔ ان دو زبردست شخصیتوں کے وسط میں سیٹھ چھوٹانی صاحب کا بٹھایا جانا اُن لوگوں کو گوارا نہ تھا۔ جو سیاسی عقاید کے اختلافات سے مانوس نہیں ہوتے۔ اور کھلا ہُوا امتیاز قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ بہرحال چونکہ بالآخر خلافت کمیٹی کے اراکین کی کثرت رائے اسی طرف تھی۔ کہ سیٹھ صاحب اور ان کے ہمراہ ڈاکٹر انصاری صاحب اور میں وزیر اعظم کی دعوت کو قبول کرلیں اس لئے اختلافات کا یہ "مرکب" تیار ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ اُمید بھی بیجا نہ تھی۔ کہ شاید ہمسفر ہونے کی حالت میں جو تبادلہ خیالات ہوگا۔ اس کے بعد کوئی متفقہ صورت پیدا ہو جائے۔ اور وزیر اعظم کے روبرو تمام اصحاب اگر یکدل ہوکر نہیں تو کم از کم یکزبان ہوکر اپنے مطالبات کو پیش کرسکیں۔

صبح کو جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ اور شب کو مسلمانان بمبئی کا ایک عام جلسہ اس غرض سے منعقد ہُوا۔ کہ سیٹھ چھوٹانی صاحب و دیگر اصحاب کو خدا حافظ

کہے۔اس موقعہ پر سیٹھ صاحب ڈاکٹر انصاری صاحب اور میں نے وزیر اعظم کی اس دعوت کے متعلق اپنے خیالات مختصراً عرض کر دئے تھے۔ میں نے صاف طور پر (اور ایک محترم بزرگ کی رائے میں ضرورت سے زیادہ صاف طور پر) کہدیا تھا۔ کہ ہم عرض و معروض کے لئے نہیں جا رہے ہیں۔ جس دن ہمارا وفد خلافت ناکام واپس کیا گیا۔ اُسی دن عرض و معروض کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ بلکہ اس کے بعد خود حکومت نے اپنے طرزِ عمل سے اُن دروازوں کو تالے لگا دیئے۔ اور اُن تالوں پر مہریں لگا دیں۔ پس ہمارا دستِ طلب اب برطانوی دروازہ کے سامنے کیونکر پھیلے؟ ہم کو طلب کیا جاتا ہے۔ اور ہم جاتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ برطانوی وزرا کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے۔ کہ ہندوستانی مسلمانوں کے نمایندوں کو بلایا۔ اور وہ نہ آئے۔ وہ جھگڑا کرنے پر تیار ہیں۔ اور مصالحت پر آمادہ نہیں۔ وہ آتے تو اس دفعہ تمام قضیئے طے ہو جاتے۔ محض اس قسم کے الزاموں سے بچنے کے لئے خلافت کمیٹی کے صدر نے وقت اور روپیہ ضایع کرنا گوارا کیا۔ پھر میں نے صاف بتا دیا تھا۔ کہ یہ کوئی وفد نہیں ہے۔ جو بھیجا جا رہا ہو۔ بلکہ چند اشخاص ہیں۔ جن کو وزیر اعظم نے معلوم نہیں کس خیال سے بلایا ہے۔ ان میں سے ہر شخص اپنی ذاتی رائے وزیر اعظم کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ البتہ جو لوگ خلافت کمیٹی سے وابستہ ہیں۔ ان کے لئے خلافت کمیٹی کا بنیادی اصول اور وہ دستور العمل موجود ہے۔ جو ہندوستان کے ہر گوشہ میں شایع ہو چکا ہے۔ اور ہر مجلس میں سنایا جا چکا ہے۔ وہی دستور العمل عامۃ الناس کی خواہشات و مطالبات کا آئینہ ہے۔ اور اُسی پر ہر خادم خلافت کو پوری طرح کاربند ہونا ہوگا۔ اس دستور العمل میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنا خادمانِ خلافت کے اختیار سے باہر ہے۔ اس لئے۔ کہ وہ شریعت اسلامی کے کھلے ہوئے احکام

پر مبنی ہے۔ پس میں نے اپنی تقریر میں اس نکتہ کو اچھی طرح بے نقاب کر دینا ضروری سمجھا کہ ہم کسی سمجھوتہ کے خیال سے نہ جا رہے ہیں۔ نہ جا سکتے ہیں۔ ہم تو صرف یہی کر سکتے ہیں۔ کہ پھر ایک دفعہ وزیر اعظم و دیگر وزرا کے سامنے اپنے مطالبات کو پیش کر دیں۔ اور پھر ایک دفعہ ان مضامین کی تشریح و توضیح کر دیں جو بارہا بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم معذور ہیں +

مجھے معلوم نہیں۔ کہ میری تقریر عام طور پر کس نظر سے دیکھی گئی۔ مگر یہ ضرور اُمید ہے۔ کہ جن محترم بزرگ نے اُس وقت نہایت نرم لہجہ میں میری صاف گوئی پر مجھے ٹوکا تھا۔ وہ اب میرے الفاظ کو قابل اعتراض نہ سمجھتے ہوں گے۔ اس لئے۔ کہ اگر ان کا یہ خیال تھا۔ کہ ہم اپنا طرز عمل ایسا رکھیں۔ کہ ہماری طرف سے گفت و شنید اور سمجھوتہ کا دروازہ بند نہ کیا جائے۔ تو اب اس حقیقت سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ دروازہ تو اس وقت بھی بند تھا۔ جب ہم بلائے گئے تھے۔ اس وقت بھی بدستور بند رہا۔ جب ہم لندن پہنچے۔ اور اب کہ ہم ہندوستان آ گئے۔ اب بھی اُسی طرح بند اور مقفل ہے +

الغرض اِن حالات میں اور اِن خیالات کے ساتھ ہم نے وطن عزیز کے ساحل کو خدا حافظ کہا +

خدا حافظ

۱۹ تاریخ کی صبح کو ہمارا چھوٹا سا قافلہ سمندر کے ساحل پر احباب و اعزا سے رخصت ہو رہا تھا۔ بمبئی کے اور باہر کے بہت سے احباب جمع تھے۔ اور وہ "تماشہ"

بھی ہو رہا تھا۔ جو ایسے موقعوں پر ہُوا کرتا ہے۔ اگر ان پھولوں کو یکجا وزن کر سکوں جو میں نے اپنی عمر میں دیکھے یا استعمال کئے ہیں۔ تب بھی ان کا مجموعی وزن اُن ہاروں اور گلدستوں سے یقیناً کم ہوگا۔ جو ۱۹۔ کی صبح کو میرے جسم پر لادے گئے تھے گلے میں ہار ڈالے جا رہے تھے۔ اتنے کہ بلا مبالغہ دم گھُٹ رہا تھا۔ ہاتھوں میں گلدستے دیئے جا رہے تھے۔ اتنے کہ سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ مجھ پر سادہ لوح مسلمانوں کی عقیدت و محبت برس رہی تھی۔ اور خدا جانتا ہے۔ کہ عقل سلیم مجھے ملامت کر رہی تھی۔ نفس ایک پختہ کار ڈاکو کی طرح جو کسی بڑے مہاجن کی دولت لوٹ کر خوش ہو رہا ہو۔ چاہتا تھا۔ کہ میں اس کے تمام تر احساس حیوانی میں غرق ہو جاؤں۔ مجھ سے داد چاہتا تھا۔ کہ ذرا دیکھنا بمبئی کے یہ لکھ پتی اور کروڑ پتی تجھے کس طرح جُھک جُھک کر سلام کر رہے ہیں! دیکھ تو وہ تیرے ہاتھوں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ وہ تیرے گلے میں ہار پہنا رہے ہیں۔ تیرے قدموں پر پھول برسا رہے ہیں۔ وہ تیری توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ تو ان کی نظر میں ایک ارفع و اعلیٰ انسان ہے۔ اے بیوقوف۔ آ۔ میرے ساتھ چلا چل۔ تیرے لئے دُنیا میں اس سے بڑی نعمت کیا ہے۔ کہ تجھ سے بہتر انسان بھی تیری تعریف کریں . . . . اس طرح اِن سادہ لوح مسلمانوں کے منوں پھُول ضائع ہو رہے تھے۔ . . . . وہ ہار جو شب کی بیخودی میں مسل کر رہ گئے ہوں۔ وہ پھول جو اوّل شام کی بدمستیوں میں کچل گئے ہوں۔ وہ لڑیاں جو محبت سے گوندھی گئی ہوں۔ اور بے پروائی سے توڑ ڈالی گئی ہوں۔ ان سب میں شراب کا سا نشہ ہوتا ہے۔ بدمستی ہوتی ہے۔ بیخودی ہوتی ہے۔ کیف گناہ ہوتا ہے۔ مگر دھوکہ اور فریب نہیں ہوتا۔ آج جو پھُول گلے میں پہنے جا رہے تھے۔ ان میں حظ نفس ہی نہیں۔ فریب بھی تھا۔ پہننے والے کی خود فریبی اور پہنانے والے کی توہین

بھی تھی۔ پوجاری جب مندر میں اپنی مورتیوں پر پھول چڑھاتا ہے۔ تو وہ پھول اس کی انکسار عبودیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ معبودیت کے طمطراق سے اس کا نفس محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن اب کہ قومی زندگی کے چشموں کا پانی گندہ ہو گیا ہے۔ موجودہ ہنگامہ میں ظاہر پرستوں نے جوش ملی کا معیار یہ قرار دیا ہے۔ کہ بہت سے پھول ہوں۔ بہت سے ہار ہوں۔ اونچی آوازیں ہوں۔ تکبیر کے نعرے ہوں۔ جلوس کے ہنگامے ہوں۔ اور تقریروں کے دریا بہیں۔ گویا کہ قومی جدوجہد کا فرض عین ادا ہو گیا!

قومیت کا صحیح تخیل قوموں کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ وہی انسان کے تمدن کو روم۔ ویونان و نینوا و بابل و بغداد و اندلس و مصر و ایران کی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ اور وہی قوموں کو فرانس و انگلستان و اٹلی کے عہد مکر و فریب اور دُور کیوں جائیں خود ہندوستان میں حکومت مُغلیہ کے عہد آخر کی تاریکیوں اور گہرائیوں میں گراتا ہے۔ آج ہندوستان کی قومیت کا تخیل قرآن کی الوہیت اور وید کی روحانیت کی ایک بوسیدہ تصویر ہے۔ وہ اس قدر پست ہے۔ کہ اب کسی ذرا سے قومی کام کے لئے انگلستان کا سفر بھی سزاوار صد تحسین و آفرین قرار پاتا ہے۔ گویا کہ جہاد کا بہترین عمل یہی ہے۔ جس کا کوئی ہندوستانی اقدام کر سکتا ہے! وہ پھول وہ ہار وہ قصیدے۔ ستائش گردں کا وہ اجتماع۔ محبت و عقیدت کی وہ نمائش۔ سب کچھ مل گیا۔ صرف اس لئے کہ کسی شخص نے تین ہفتہ انگلستان میں رہ کر دو چار ملاقاتیں کرلیں۔ دس بیس تحریریں لکھدیں۔ اور چند تقریروں میں اسلامی مسائل کے گھوڑے دوڑا دیئے۔ جب تخیل کی پستی کا یہ عالم ہو۔ اور نظر اس قدر محدود ہو۔ کہ پی اینڈ او کمپنی کے پانی پر تیرنے والے عشرت محل میں چند روز سفر کرنا۔ اور چند روز انگلستان و پیرس کی تہذیب و تمدن کی مینا کاری

سے متمتع ہونا بھی ایک مجاہدہ قرار پائے۔ تو جان لیجئے۔ کہ اُس قوم کا مرض پُرانا ہے اور اب علاج محض گرمیٔ سخن سے نہ ہوگا۔ کچھ آج نہیں۔ میرے دل میں یہ خیال اکثر آیا ہے۔ کہ آخر یہ تماشے کب ختم ہوں گے۔ تماشہ گاہ میں ہر شب کو تاج الملوک بکاولی کے سرہانے پہنچ جاتا ہے۔ لیکن صبح کو جب تماشہ ختم ہُوا۔ تو اس تاج الملوک نے بھی رات کے رنگ و روغن کو گرم پانی سے دھو ڈالا۔ اور بکاولی کی نرگس شہلا کا سرمہ بھی بہ گیا! اس بدنصیب براعظم کے تماشا گاہ میں شب و روز یہ تماشے ہو رہے ہیں۔ لمبی تانیں۔ بلند آوازیں۔ بہت سے خوب صورت ہار اور گلدستے پھولوں سے لدی ہوئی گاڑیاں اور جلوس۔ قوم کی بیداری کی روشن دلیلیں یہ ہیں! خدمت و مخدومیت کا تخیل وہ تاج الملوک ہے۔ جس نے بکاولی کو محض خواب میں دیکھ لیا ہو۔ اور ایک کاغذ کا پھول بنا کر دکھاتا پھرے۔ کہ یہی میرا گلِ مراد ہے!

سمندر پر

پندرہ دن کے اس بحری سفر کی نوعیت یوں تو وہی تھی۔ جو ہر ایسے سفر کی ہوا کرتی ہے۔ صبح سے شام تک جبڑوں کا چلتا رہنا۔ معدہ کا ہندوستانی ریلوں کے تھرڈ کلاس کی طرح لادا جانا۔ سمندر کی صحت بخش ہوا میں اشتہا کی شدت راستہ میں ملنے والے جہازوں کا نظارہ۔ کہیں کوئی جزیرہ نظر آجائے تو اس کا تماشہ سمندر میں کم یا زیادہ تلاطم ہو تو اپنے کمروں میں پڑا رہنا۔ اور زندگی کا یک گونہ بے لطف ہو جانا۔ موسم اچھا ہو تو جہاز کے عرشہ پر تفریح و ورزش۔ دو چار ہمسفروں کے ساتھ چہل قدمی اور گپ۔ جہاز کے مختصر کتب خانہ کی کتابوں کا مطالعہ۔ ان میں

سے کوئی چیز بھی نئی نہیں۔ کہ تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے یا پڑھنے والوں کی معلومات
میں اضافہ کرے۔ جب کسی کا پہلا بحری سفر شروع ہوتا ہے تو ہمیشہ بڑے بڑے
ارادے جہاز پر ساتھ جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ تو یہ خیال ہوتا ہے کہ سفرنامہ
اور روزنامچہ تو ضرور ہی لکھا جائے گا۔ وہ ایک بڑی مفصل اور دلچسپ کتاب ہوگی
جو ہندوستان واپس آکر شایع کی جائے گی۔ اور اگر دل میں ارمان زیادہ ہیں۔ تو
اس ذریعہ سے اپنی شخصیت کا اچھا خاصہ اشتہار بھی دیا جا سکے گا۔ اور اگر مفلس
ہیں تو کتاب کو فروخت کر کے خالی جیب پر بھی کچھ احسان کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ
یہ ارادے تو سب کچھ ہوتے ہیں۔ اور جہاز پر پہنچ کر پہلا خیال میرا بھی یہی تھا۔
کہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں۔ مگر اس کی تکمیل صرف اتنی ہی ہوئی۔ کہ کبھی کبھی ایک
دو صفحے لکھے۔ اور پھر ان کو واپسی کے وقت تک نہ دیکھا! اب جو اُن صفحات
کو لکھنے بیٹھا تو وہ پرزے بھی یاد آئے۔ جہاز کی زندگی دلچسپیوں سے خالی نہ
تھی۔ لیکن اُن دلچسپیوں سے لُطف اندوز ہونے کے لئے کالا آدمی کافی اہلیت
نہیں رکھتا۔ پانی پر تیرنے والا عشرت محل جس کو عہد جدید کی اصطلاح میں
"جہاز" اور "کشتی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ "سرود خانہ ہمسایہ" اور "حسن رہ گزرے"
کے تمام روح پرور کرشموں سے بھرا ہوتا ہے۔ غالب مغفور نے اس "جنت نگاہ"
اور "فردوس گوش" کو دیکھا ہوتا تو ان کی "چو گوشیہ" سطح سمندر کی لہروں پر رقصاں نظر
آتی۔ میں جو صبح سے شام تک جہاز کے ہر گوشہ میں وہ خود آرائیاں دیکھتا تھا۔
تو نظر چرا کر گردن جھکا لیتا تھا۔ گویا کہ خطاوار میں ہوں! ایک دوست تو اپنے
عہد جاہلیت کو یاد کر کے ٹھنڈے سانس کے ساتھ یوں بھی فرماتے تھے۔ کہ

عید ہوئی ذوق والے شام کو

اگر "نفسیات" کا کوئی مبصر ان جہازوں پر سفر کرے۔ اور بشرطیکہ مقناطیسیت

سے متاثر ہونے والے تمام جذبات کو بمبئی کے ساحل پر چھوڑ آئے۔ تو وہ اس "بار بردار فریب حسن" میں اپنی بصیرت کے لئے ایک وسیع میدان پائے گا۔ اس ہاتھی کی طرح جس پر ریشم کے ہزاروں تھان اور جواہرات کی سیکڑوں بوریاں لدی ہوئی ہوں۔ ہمارا جہاز ہزارہا میل کا سفر کرتا ہے۔ اور بمبئی سے لے کر عدن و سویز و پورٹ سعید و ساحل فرانس و انگلستان تک یہ گراں مایہ امانت پہنچا دیتا ہے۔ کرشموں اور تجلیوں کا وقت ہمیشہ سے وہی ہے۔ جب سورج کی روشنی باقی نہ رہے۔ یوں تو جہاز مغرب کے بعد بھی بجلی کی روشنی سے بقعہ نور بنا دیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی عرشہ کے بہت سے کونے تاریک رہتے ہیں! جب بجلی کی روشنی میں باریک ریشم کے اندر سفید جسم جھلک چکیں۔ اور کھلے ہوئے سینوں پر جواہرات اپنی دمک دکھا چکیں تو پھر تاریک گوشوں کا سکون کس قدر عزیز ہوتا ہے! شب کے دسترخوان پر جہاز کی ساری پونجی سفید کھال۔ باریک کپڑے۔ خوب صورت بال۔ درخشاں جواہرات۔ ان سب کی ڈھیریاں لگی ہوتی ہیں۔ ہر کرسی پر ایک چھوٹی سی دکان ہوتی ہے۔ اور اس دکان پر ہر قسم کی جنس رکھی ہوتی ہے۔ ایک نیک بخت کو روز دیکھتا تھا۔ کہ وہ ہر وقت اپنے کھلے ہوئے سینہ کو نہایت باریک جالی کے بالشت بھر ٹکڑے سے چھپانے کی کوشش فرماتی تھیں۔ مگر وہ جالی کا ٹکڑا ہر دفعہ ان کے شانوں سے پھسل کر نیچے گرنے پر اصرار کرتا تھا۔ پس برابر بیٹھنے والے مرد کا اخلاقی فرض ہوتا تھا۔ کہ وہ اس ٹکڑے کو اٹھا لے اور ان کے سڈول شانوں پر ڈال دے۔ ایک دوسری بیگم صاحبہ میرے سامنے ہی ایک میز پر تشریف رکھا کرتی تھیں۔ ان کی نازک پاپوش کا تسمہ بار بار کھل جانے کا عادی مجرم تھا۔ مگر جب وہ کھلتا تھا۔ تو ہمراہیوں کا اضطراب قابل دید ہوتا تھا۔ ہر شخص دوڑتا تھا۔ کہ پہلے یہ تسمہ میں لگا دوں! ایک دن ایک عجوزہ بھی

کے پاؤں میں موچ آگئی۔ حادثہ اُوپر کے عرشہ پر پیش آیا تھا۔ کوئی صورت نہ تھی۔ کہ ان کو اس حال میں کمرہ تک پہنچایا جاتا۔ آخر چند مجاہدوں میں سے ایک نے جرأت مردانہ کا اقدام کیا۔ اور گود میں اُٹھا کر اُس بارِ عزیز کو نیچے پہنچا دیا +

اِس جلوہ گاہ میں چند پارسی اور یہودی خواتین بھی تھیں۔ جن کو اپنی یورپین بہنوں سے ایک قدم بھی پیچھے رہنا گوارا نہ تھا۔ دن بھر اور رات کو بھی گیارہ بارہ بجے تک اِن خواتین کا پرشور ہجوم عرشہ پر رہا کرتا تھا۔ شاید دُنیا میں بمبئی کے پارسی بھائیوں سے زیادہ کسی قوم کو اس قدر چیخ چیخ کر بات کرنے والی خواتین نصیب نہیں چیخنا صرف آواز ہی کا فعل نہیں ہے کبھی کبھی بعض بہنوں کی وضع قطع گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی ہے۔ ان کا لباس چیختا ہے۔ ان کی نگاہیں چیختی ہیں۔ ان کے موزوں کی باریکی اور جوتوں کی نزاکت چیختی ہے۔ ان کی ساریوں کا رنگ چیختا ہے جنس لطیف کا یہ "غوغا" بازاروں کے عامیانہ چیخ و پکار سے اکثر سننے والے اور دیکھنے والے کے لئے بہت زیادہ دلدوز اور دردناک ہوتا ہے! میرا تخیل یہ ہے کہ عورت چیخ نہیں سکتی۔ شعر چیخ نہیں سکتا۔ بول سکتا ہے! تصویر چیختی نہیں۔ مُسکراتی ہے۔ یا بسورتی ہے۔ اور اگر اس کا رنگ و روغن چیخنے لگے۔ تو پھر وہ نظر فریب نہیں! بعض اوقات ان پارسی بہنوں کا ادعائے شانِ نسوانیت میری نظر میں ان کو اُس شعریت سے بہت دور پھینک دیتا تھا۔ جو عورت کا صحیح مفہوم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ نسوانیت اس قدر بلند آہنگ ہو سکتی ہے۔ یا عورت اس طرح اپنے ڈھل اور نقارے بجا سکتی ہے۔ یورپ میں اس قسم کی خودنمائی سے نظر خوب آشنا ہوئی۔ وہ خودنمائی بے عیب اور بے لوث نہ تھی۔ تاہم اس میں یہ شعریت کو یکسر فنا کر دینے والا خروش بھی نہ تھا!

اِسی جہاز میں ایک ہندوستانی رانی صاحبہ اور ان کی نوجوان لڑکی بھی

انگلستان جا رہی تھیں۔ اس ہنگامہ میں صبح سے شام تک وہ دونوں اپنی کرسیوں
پر سب سے الگ بیٹھی رہتی تھیں۔ میں گو کہ اپنے وجود کو جہاز کی اس دُنیا سے
دُور پاتا تھا۔ تاہم دن میں ہر دفعہ جب رانی صاحبہ پر نظر پڑتی تھی۔ تو تخیل کا
ایک عجیب ہیولہ پیش نظر ہوتا تھا۔ ایک طرف یورپ کے تمدن و معاشرت کے
تمام مصنوعات اور نقاشیوں کو دیکھتا تھا پھنچتی ہوئی (ناظرین میری اس اصطلاح
سے درگزر فرمائیں) نسوانیت سے اُکتایا اور بعض اوقات جھنجھلایا کرتا تھا۔ اور
دوسری طرف ہندوستان کی ایک عورت اور لڑکی پر نظر جاتی تھی۔ جو اس فریب
نظر میں گھری ہوئی تھیں۔ تاہم اس سے دُور تھیں۔ بے پردہ تھیں۔ مگر پردہ
میں تھیں۔ بے نقاب تھیں۔ مگر نقاب میں تھیں۔ حیا کا مفہوم اگر کچھ ہے۔ تو اب
بھی ہندوستانی عورت کے وجود روحانی میں موجود ہے۔ از راہ تعصب نہیں کہتا۔
یورپ کے بہت سے اوصاف کا معترف ہوں۔ مگر یہ جوہر تہذیب و تمدن اُن
بازاروں میں بہت کمیاب ہے۔ جب اس ہنگامہ میں رانی صاحبہ کو دیکھتا تھا
تو اپنے دماغ میں پاکیزہ نسوانیت کی ایک عجیب تصویر پاتا تھا۔ جس کی ایک
جھلک بھی یورپ کے مبصرین نفسیات نہیں دیکھتے۔ وہ محض فریب نظر کے
مجروح ہیں! ایک شب عرشہ پر ناچ ہو رہا تھا۔ رانی صاحبہ بھی ایک گوشے میں
اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی محفل کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ میں ایک طرف کھڑا سوچتا
تھا۔ کہ یورپین نسوانیت کی یہ تصویریں جن پر دُنیا بھر کے فنون لطیفہ صرف ہوتے
ہیں۔ انسان کے محسوسات عالیہ سے کیوں دور رہتی ہیں۔ یورپ کی عورت شب
کے لباس میں جو اس کے لئے زیب و زینت کا منقطع ہے۔ گردن سینہ کے انتہائی
حدود تک کھلی ہوئی۔ بازو بغلوں سے اُوپر تک برہنہ۔ مرد کے اعلیٰ تخیل کو مس
کرنے کی بجائے درحقیقت اس کی مادیت کو متحرک کرتی ہے۔ اور ایک دُنیا ہے

کہ اس سحر کاری پر مبنی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کی عورت تعلیم و
وتمدن و معاشرت میں چاہے اپنی یورپین بہن سے دو قدم آگے بڑھ جائے۔
چاہیے وہ اپنے لباس میں آداب حجاب وحیا کی پوری پابندی نہ کرتی ہو۔ لیکن
آنکھ میں غرور نسوانیت۔ وہ تمکین حیا پھر بھی محفوظ رکھتی ہے جس کا وجود یورپ
میں عام طور پر نظر نہیں آتا۔ تعصب نسل ومذہب سے قطع نظر میں نے تو یورپین
اور ایشیائی عورت کی تصویروں کو جب دیکھا۔ قلب نے گواہی دی۔ کہ آنکھ اگر
روح کا آئینہ ہے۔ تو اس ذریعہ سے کالی عورت کی اعلیٰ روحانیت صاف نظر
آسکتی ہے۔ ایک موٹی میم صاحبہ کو (غالباً فرانسیسی تھیں) ہر روز دیکھتا تھا۔
کہ وہ دن میں دو دو دفعہ لباس تبدیل فرما کر تشریف لاتی تھیں۔ ہر شام کو ان
کے لباس میں جدت طرازیوں کا گوناگون اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ بیچاری وزن میں
شوکت علی صاحب سے کم نہ ہوں گی۔ جسم نازک پر لباس فاخرہ کا ٹانکا اپنے میں
تاب مقاومت نہ پاکر اور اس کشمکش سے تنگ آکر جو جسم کی ہر حرکت سے اسکے اندر
پیدا ہوتی تھی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چیختا تھا۔ صحت جسمانی ماشاء اللہ ایسی تھی۔ کہ
ہم سے دائم المریض رشک کریں۔ اُس دبیز جسم نے نسوانیت کی لطافت و نزاکت
کو بالکل دبا لیا تھا۔ تاہم وہ جب شب کے نہایت باریک کپڑے پہن کر نکلتی
تھیں۔ تو از راہ غایت انکسار اپنے کو پری سے کم نہ سمجھتی تھیں! قدم اُٹھاتی
تھیں۔ تو نظر ہر طرف دوڑتی ہوتی تھی۔ کہ کسی نے دیکھا یا نہیں۔ موٹی کمر لچک
نہ سکتی تھی۔ مگر پھر بھی لچکائی جاتی تھی۔ پنجوں پر چلنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ کہ یہ
بھی ایک "ادا" ہے۔ لیکن جسم نازنین کا وزن لکڑی کے فرش کو تھرا دیتا تھا!

یہ تو حال تھا۔ لیکن نظر فریبیوں کے زخم نصیب یہاں بھی حاضر تھے . . . .
یہ کیا ہے؟ نسوانیت کا کیسا ادنیٰ تخیل ہے! غرور نسوانیت کی کیسی بھدی تصویر

ہے! وہ غرور نسوانیت جس کا سارا سرمایہ جسم کی سفید کھال۔ خوشبودار پوڈر اور باریک ریشم ہو۔ یقین جانئے کہ اس نسوانیت کی روح گم ہوگئی ہے! یہ کاغذ کی جاپانی قندیلیں ہیں۔ جن کے اندر موم کی بتی گل ہو چکی ہے۔ اور خالی قندیلیں ہوا میں جھول رہی ہیں! لیکن کم نظر روشنی کے طالب نہیں۔ بلکہ قندیل کا غذ خوب صورت چاہتے ہیں!

فریب حسن اور خود بینی کے ان نمونوں کا ذرا اس کالی رانی سے مقابلہ کیجئے۔ جو دولت میں شاید تمام یورپین بہنوں سے زیادہ ہوگی۔ ثروت وجاہ دُنیا کے لحاظ سے اس جہاز پر اُس کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ تعلیم و تہذیب و تمدن و معاشرت میں وہ لندن و پیرس کے بہترین نمونوں کے دوش بدوش تھی۔ تاہم چشم حقیقت بیں گواہی دیتی ہے۔ کہ وہ سب سے مختلف۔ الگ' دُور۔ اور بلند تھی! دن کا اکثر حصہ عرشہ پر گزرتا تھا بارہا ان "کالی" ماں بیٹیوں پر نظر جاتی تھی۔ اور قلب پکار اُٹھتا تھا۔ کہ اگر قوموں کی کام یاب زندگی کے لئے عورتوں کی فطرت عالی اور خصائص حسنہ کی شرط لازمی ہے۔ تو پھر میری قوم کا مستقبل ان کالی عورتوں کے ہاتھ میں محفوظ ہے۔ وہ کچھ ہی ہو جائیں۔ مگر ان کی فطرت آلودہ نہیں!

عدن

پانچویں دن ہمارا جہاز عدن پہنچا۔ بہت سے تجارت پیشہ مسلمان اور ہندوستانی جو یہاں مقیم ہیں+ جہاز پر ہم لوگوں سے ملنے آئے۔ چونکہ جہاز تین چار گھنٹہ قیام کرنے والا تھا۔ اس لئے یہ اصحاب ہم کو بہ اصرار شہر میں لے گئے۔ میری عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ مجھے اس سرزمین پاک پر قدم رکھنا نصیب ہوا۔

جس کا ایک ایک ذرہ ہر مسلمان کو عزیز ہے۔ کاش کہ انگلستان کے یہ مسافر جو نام نہاد پیروان مسیح کی بارگاہ میں انصاف مانگنے جا رہے تھے۔ ایک دفعہ اُس دروازے پر بھی جاتے۔ جو تیرہ سو برس سے ایک عالم کے لئے باب رحمت ہے۔ اور آج ہم سیہ بختوں کے عہد میں ایک غاصب اُس کی چوکھٹ پر بیٹھا ہُوا تمام دیرینہ عظمت اسلامی کا خون کر رہا ہے۔ جس حریم رسالت میں ایک دُنیا آنکھیں بچھاتی ہے۔ وہاں آج اُس غاصب کی ہوسناکیوں نے یہ حال کر دیا ہے۔ کہ سفر افرش بھی میسّر نہیں! ابھی ہندوستان کے بدبخت مسلمانوں کو اتنی توفیق بھی ہوئی۔ کہ وہ ارض مقدس کے ان انقلابات پر ایک نظر کرتے۔ اور اپنی رگوں میں اسلاف اسلامی کی عصبیت کو متحرک پاتے! شہر عدن میں جابجا حبشیوں کے گھر نظر آتے ہیں۔ گھروں کے دروازوں پر خوب صورت بکریاں بندھی ہوتی دیکھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھیلتے ہوئے پایا۔ مگر فارغ البالی اور خوش حالی کے آثار نظر نہ آئے۔ میں سوچتا تھا۔ کہ عدن کے ان حبشی باشندوں میں کتنے ہیں۔ جن کو بلالؓ کی وراثت سے ایک ذرہ کا لاکھواں حصّہ بھی نصیب ہُوا ہو۔ آج اے حبش۔ کہ اسلام کے سب سے پہلے مہاجرین نے تیرے ریگستانوں کو آباد کیا۔ آج تو "بلال" کو بھی نہیں جانتا! عدن کے کوچۂ بازار میں حبشی بہت سے تھے۔ مگر میری آنکھیں اُس "بلالیت" کو ڈھونڈھتی رہیں۔ جو وہاں نہ تھی۔ بلا مبالغہ سیکڑوں حبشی اور سیاہ فام عرب دیکھے۔ کہ وہ شہر سے ساحل تک اور ساحل سے شہر تک مسافروں کے ساتھ بھاگتے ہوئے آتے تھے شاید کہ ایک پیسہ مل جائے! جب ان کے ہاتھ خیرات لینے کے لئے بڑھتے تھے۔ تو میں آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ کہ اے کارساز! یہ ہاتھ جو آج خیرات لینے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ کیا وہی ہاتھ ہیں۔ جو صدیوں تک دینے کے لئے

بڑھا کرتے تھے؟ یہی ہاتھ تھے جو اس ارض پاک کی حرمت کا جھنڈا لے کر اکناف عالم میں ڈنکے بجا آئے؟ دُنیا میں طوفان لانے والے آج کیوں دنیا کے طوفان میں غرق ہیں؟

اے دُرِّ تابندہ اے پروردہ آغوش موج
لذت طوفان سے ہے نا آشنا دریا ترا!

دامن عربستان کے اِن دھبوں کو دیکھ کر دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں میں ایک جھر جھراہٹ پیدا ہوئی . . . غم کی ایک ٹوٹی ہوئی تان کچھ نکلی اور کچھ دب گئی!

بہت سے دولت مند عرب بھی دیکھے۔ جو اپنی موٹروں میں اُڑے پھر رہے تھے۔ کیا یہ بھی عہد نبوت کے ان شتربانوں کی نسل ہے۔ جو ناقہ رسالت کی ڈوری پکڑ کر چلتے تھے؟ کیا وہ بھی طارق کی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہونے والوں کے اخلاف ہیں جو جہاز کے سامنے پانی میں غوطے لگا رہے تھے کہ شاید کوئی مسافر ایک پیسہ پھینک دے!

معلوم نہیں عدن کی پہاڑیوں کے دامن میں پانی کے حوض کس نے بنائے تھے۔ جن کو آثار تاریخی کا جویاں سیاح دیکھنے جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ حوض ایرانیوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ عربوں کے کسی پرانے قبیلہ نے صدیوں پہلے اِن حوضوں کو تیار کیا تھا۔ تاکہ پہاڑوں کا پانی ان کے اندر جمع کیا جا سکے میں نے بھی جا کر دیکھا۔ آج یہ حوض خشک پڑے ہیں۔ پہاڑ بھی خشک ہیں۔ اور ان کے چشمے بھی بے آب ہیں۔ لاریب کہ عدن کے تمام چشمے خشک ہیں۔ پانی کے چشموں کا کیا ذکر عرب کی انسانیت کے چشمے بھی خشک ہیں۔ اور جہاں کچھ پانی ہے۔ تو اس کو بھی گندی مچھلیوں نے گندہ کر دیا ہے!

ایک دوست نے اس مسودہ کو دیکھ کر کہا۔ کہ تو نے سیٹھوں کی دعوت کا تو کچھ حال بھی بیان نہ کیا۔ لہٰذا گزارش ہے۔ کہ دعوت خوب تھی۔ یہ نہ سمجھ سکا۔ کہ محض چاء کی دعوت تھی۔ یا ضیافت شب۔ یا دونوں کا مرکب تھا۔ غرض جو کچھ تھا۔ میرے لئے یہ صدمہ کافی تھا۔ کہ کچھ کھا نہ سکا۔ وقت کم تھا۔ اور مجھے اس دعوت کی خبر ہندوستان کے اخبارات کو بذریعہ تار روانہ کرنی تھی! دعوت کھانے سے زیادہ اُس کی خبر کا شایع کرانا ضروری تھا! اس لئے کہ کھانا اور کھلانا سب بے کار ہے۔ اگر کھانے والے کے کھانے اور کھلانے والے کی کھلانے کا حال دُنیا پر روشن نہ ہو جائے! تمدن اور مہذب زندگی کے لئے یہ بھی منجملہ شرائط لازمی ہے سیٹھ چھوٹانی صاحب کو بہت تردد تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ضیافت کا پورا حال ہندوستان کو معلوم نہ ہو سکے۔ اور وفد کی قومی خدمات کی یہ بسم اللہ تفصیل کیساتھ اخبارات تک نہ پہنچے!

سسلی (صقلیہ)

جب ہمارا جہاز ایک دن صبح عظمت اسلامی کے اس مزار کو مس کرتا ہوا گزرا۔ جس کو اب جزیرہ سسلی کہا جاتا ہے۔ تو وہ لمحہ رقت قلب۔ عبرت بندامت و شرم اور غیرت کا ایک عجیب لمحہ تھا۔ جس نے دل کے بے صدا تاروں کو پھر دفعتاً ایسا کھینچا۔ کہ میں مبہوت رہ گیا۔ (اور کون مبہوت نہ رہ جاتا) ان تاروں میں برسوں کے بعد نہ جانے کہاں سے ایک جھرجھراہٹ سی پیدا ہوئی! میں شاعر نہیں۔ میرے حیات قلم کے قابو میں بہت کم آتے ہیں۔ نہ زبان ان کو سنبھال سکتی ہے۔ تاہم اس سارے افسانہ کا وہی ایک ورق تھا جو میں نے

اس گہوارہ سطوت اسلامی کے سواحل کے سامنے بیٹھ کر لکھا۔ اور اپنے بساط کے مطابق بُرا نہیں لکھا۔ اسپین کے نشانات تو ابھی دیکھے نہیں۔ الحمرا اور قرطبہ کے درو دیوار ہنوز ایک تصویر خیالی ہیں۔ لیکن اس بجھے ہوئے چراغ رنگزار کو دُور سے دیکھ لیا۔ اور اپنے آنسوؤں اور آہوں کا تحفہ اُس خاک پر پیش کر دیا۔ جس نے قرون اعلےٰ کے ان دست نوردوں کے قدم چومے تھے۔ جن کے کفن قیامت تک میلے نہ ہوں گے! وہ ورق جو میں نے اس ایک "عالم" میں لکھا تھا۔ کسی دوست کی عنایت سے اس مسودہ میں باقی نہیں۔ میں اب اس کے لکھنے کے لئے زندگی کا وہ عجیب لمحہ کہاں سے پاؤں ناچار یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ جن میں وہ درد بھری موسیقی نہیں ہے۔ جو کبھی کسی ساز سے کسی تار سے خود ہی نکلا کرتی ہے۔ اور پھر اس ناقدر شناس دنیا سے غائب ہو جاتی ہے۔ انسان چاہے کہ پھر اُسی تار کو چھیڑے اور ویسی ہی آواز پیدا کر لے۔ ممکن نہیں۔ غرض میں نے تاریخ اسلامی کے اُس ایک ورق کو جو بحر اوقیانوس کے سینہ پر پڑا ہوا ہے۔ چند گھنٹے خوب دیکھا۔ جبتک جہاز اس ساحل کے قریب رہا۔ میری نظریں اس خاک پر جمی رہیں۔ میں یہی کہتا تھا۔ کہ الٰہی! اس ورق پر اس عہد رفتہ کا لکھا ہُوا کوئی ایک حرف بھی کہیں باقی ہوگا۔ ان آبادیوں میں۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں۔ ان چٹانوں پر۔ کہیں بھی کوئی نقش باقی ہوگا۔ جس پر کوئی صاحب نظر سجدہ کر لے! سنتا ہوں کہ اب کچھ باقی نہیں! جب اٹلی گیا تو یہ خیال آیا۔ کہ لاؤ ایک دن کے لئے اس اُجڑے گھر کو بھی جا دیکھیں۔ لیکن بتانے والوں نے بتایا کہ وہاں اب کوئی نشان باقی نہیں۔ کوئی نام باقی نہیں! کاش کہ اقبال مجھے اپنی اس کیفیت کا ایک لمحہ دے دیتے یا دے سکتے۔ جس نے ان سے کبھی وہ نوحہ لکھوایا تھا۔

(کیا جانے اب بارگاہ حکومت سے "سرفراز ہو کر ہندوستان کے اس بلبل نالہ کش
کی موسیقی اب ہم کیسے سُنیں گے۔ جسکی موسیقی صرف ایکدل گداختہ ہی سے پیدا ہو سکتی ہے"
رو لے اب دل کھولکر اے دیدۂ خوننابہ بار۔ وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار،
یہ محل خیمہ تھا ان صحرا نشینوں کا کبھی۔ بحر بازیگاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی،
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے۔ شعلۂ جانسوز پنہاں جن کی تلواروں میں تھے،
آفرینش جن کی دُنیائے کہن کی تھی اجل۔ جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل،
زندگی دُنیا کو جن کی سوزش قُم سے ملی۔ مخلصی انسان کو زنجیر توہم سے ملی
جنکے آوازے سے لذت گیر ابتک گوش ہے۔
وہ جرس اب کیا ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟

آہ اے سسلی! سمندر کی تھی تجھ سے آبرو۔ رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو،
زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے۔ تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے،
ہو سبک چشم مسافر پر ترا منظر مدام۔ موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام
تو کبھی اُس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتشیں نظارہ تھا،

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر۔ داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر،
آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی۔ ابن بدرو کے دل ناشاد نے فریاد کی،
مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا۔ یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا،
ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستان۔ تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیان،
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں۔ جسکی تو منزل تھا میں اُس کارواں کی گرد ہوں،
رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلادے مجھے۔ قصۂ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے،
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستان لے جاؤں گا۔

خود یہاں روتا ہُوا اوروں کو وہاں رلواؤں گا"

واپسی کے وقت ہمارا جہاز شب کی تاریکی میں سسلی کے قریب گزرا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ جہاز کی ساری آبادی غافل سو رہی تھی سوتے سوتے میری آنکھ کھلی۔ کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ایک خواب دیکھا۔ ایک طرف سمندر میں دور تک تیز روشنیاں نظر آئیں۔ اور وہ سماں اس وقت بہت ہی عجیب معلوم ہوا۔ واقعی میں یہ سمجھا۔ کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن نیند کا نشہ کچھ کم ہُوا تو بجلی کی وہ روشنیاں سسلی کے ساحل پر نظر آئیں۔ جہاز عموماً ساحل سے اس قدر قریب گزرتا ہے۔ کہ دن کی روشنی میں شہر کے مکانات۔ سڑکیں۔ حتیٰ کہ آدمی چلتے پھرتے صاف نظر آتے ہیں۔ شب کی تاریکی میں یہ تو کچھ نہ تھا مگر بجلی کے چمکتے ہوئے قمقموں نے مجھے ہندوستان کا ایک گورستان یاد دلا دیا۔ جہاں میں نے ایک دفعہ ایک عجیب تماشہ دیکھا تھا۔ ہم لوگ رات کو ۱۲ بجے ایک دوست کو دفن کرنے شہر کے باہر ایک پرانے قبرستان میں گئے بیس پچیس آدمی تھے۔ اور دو تین لالٹینیں ساتھ تھیں قبرستان بہت وسیع اور بہت پُرانا ہے۔ ہم ہنوز دفن سے فارغ نہ ہوئے تھے۔ کہ قبرستان کے ایک کونے میں بہت سی روشنیاں (جیسی مشعلیں جلتی ہوں) نمودار ہوئیں رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھتی گئی۔ اندھیری رات میں مشعلیں اس طرح روشن نظر آئیں۔ کہ ہم سب بہت ہی خوفزدہ ہوئے۔ تاہم وہ خوف اس قسم کا تھا۔ کہ سانپ کی آنکھ کی طرح اُن روشنیوں کی چمک نے ہماری نظروں کو مسحور کر لیا۔ ڈرتے جاتے تھے۔ مگر نہ بھاگنے کی ہمت تھی نہ منہ پھیر سکتے تھے۔ سوائے روشنیوں کے کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یہ تماشہ تقریباً آدھ گھنٹہ تک رہا۔ اس کے بعد مشعلوں کا وہ جلوس آہستہ آہستہ گورستان کے ایک دوسرے گوشہ کی طرف جا کر غائب

ہوگیا۔ اے فلسفی! تو کیا کہتا ہے؟ اے ماہر سائنس! تیرا نظریہ کیا ہے؟ اے ملا! تو کیا سمجھتا ہے؟ اے حکیم! تو نے کیا سوچا! اور اے صوفی! تو کیا دیکھتا ہے!

غرض اس شب کو صقلیہ کی روشنیوں نے مجھے وہی قبرستان والا سماں یاد دلایا۔ اور صبح تک دل اور دماغ باہم جھگڑتے رہے!

یہ سب کچھ تو کہا۔ مگر قلم روکتا ہوں۔ تو دل کہتا ہے۔ ایک سسلی ہی کے لئے کیا رونے لگا! یہاں تو سارا سمندر ایک اشک حسرت ہے! یہی تو وہ بحر اوقیانوس تھا۔ جسکے ساحل پر سپہ سالار اسلام۔ فاتح افریقہ۔ عقبہ ابن نافع نے بیچین ہو کر گھوڑا پانی کے اندر ڈال دیا تھا۔ اور اپنی تلوار کو بے نیام کر کے کہا تھا۔ کہ "خدایا اگر مجھے یہ سمندر نہ روک لیتا۔ تو مغرب کی طرف بڑھا چلا جاتا۔ اور تیرے نام پاک کی کبریائی کا وہاں بھی اعلان کرتا اور ان لوگوں کو تیری طرف راستہ دکھاتا جو دوسروں کو پوجتے ہیں" قیروان کا نامور بانی خود آگے نہ جا سکا۔ لیکن آنے والی نسلیں اسلام کا نام لے کر سمندروں میں گھس گئیں۔ اور آج ان ناپیدا کنار دریاؤں کی گہرائیوں میں جدھر چاہے اسلام کے ان فاتحین کا نقش قدم دیکھ لیجئے۔ میں ابھی سسلی کو دیکھ دیکھ کر اقبال کا نوحہ پڑھ رہا تھا۔ دو ہی دن بعد ہمیں جزیرہ سارڈینا کے پہاڑوں کی بلند چوٹیاں نظر آنے لگیں۔ یہ جزیرہ بھی کبھی سلطنت روما کے طاقتور پنجہ سے نکل کر پرچم اسلامی کے سایہ میں آیا تھا۔ خبر نہیں وہاں بھی عہد اسلامی کے کچھ آثار باقی ہیں یا نہیں۔ باقی ہوں یا نہ ہوں۔ نام تو باقی ہے۔ بہت سے جہاز اس سمندر میں گزرتے ہیں۔ ان جہازوں پر ہزاروں مسلمان خلاصی اور سیکڑوں مسلمان مسافر بھی گزرتے ہونگے لیکن کتنے ایسے ہیں جن کو یہ خبر ہے۔ کہ اس سمندر کے

پانی میں فدائیان اسلام کا کس قدر خون ملا ہوا ہے! رونے کو نہیں کہتا۔ رونے کا قائل نہیں۔ مگر یہ ایک درس عبرت ہے! آنکھیں کیوں بند کیجئے۔ ہاں مگر غریب ہندوستان والے کیا کریں۔ یہاں مدرسوں میں نپولین۔ کرامول اور نلسن کے سوا ہے کیا۔ انہیں کیا معلوم کہ بحر اوقیانوس میں بھی کبھی اونٹ والے گھس جایا کرتے تھے! وہ آرمیڈا کے نام سے تو واقف ہیں۔ مگر عقبہ ابن نافع کے گھوڑے اور طارق کی کشتیوں کا حال انکو کیونکر معلوم ہو! غلامی کا اصلی زہر یہ ہے! پھر کیا تعجب ہے۔ کہ یہ غافل دُنیا میں جدھر جاتا ہے۔ اپنی زندگی کو تلخ پاتا ہے!

باہم تبادلۂ خیالات

عدن کے بعد سفر کا باقی زمانہ بھی معمولی مشغلوں میں گزرا۔ پورٹ سعید یورپ کا ڈانڈا ہے۔ یہ مقام (گو میں خود شہر میں نہ جا سکا مگر سنتا ہوں۔ کہ) یورپ کی ادنیٰ زندگی اور اخلاقی پستی کی ایک اچھی نمائش گاہ ہے۔ جہاں مشرق سے آنیوالا مسافر سب سے پہلے مغرب کے بدترین عناصر سے دوچار ہوتا ہے۔ بازاروں میں وہی ہنگامہ آرائیاں اور عشوہ فروشیاں ہیں۔ وہی عیش پرستی اور بدمستی ہے۔ وہی دولت کی سحر کاری ہے۔ وہی قہوہ خانے اور تھیٹر ہیں۔ اور اخلاقی زندگی کی وہی بے اختیاریاں ہیں۔ جن کا تماشہ ہم نے یورپ کے سفر میں قدم قدم پر دیکھا۔ پس مارسیلز تک بقیہ سفر کے حالات سے قطع نظر کرتا ہوں +
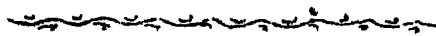
۵ مارچ کی صبح کو ہمارا جہاز مارسیلز پہنچا۔ اُسی دن شام کو ہم پیرس کی طرف روانہ ہو گئے۔ مارسیلز میں فرانسیسی زندگی کا پہلا نظارہ دیکھا۔ پیرس میں دو دن قیام رہا۔ اور مارسیلز کی ایک جھلک میں جو کچھ دیکھا۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل پیرس میں نظر آئی۔ تاہم چونکہ جلد سے جلد لندن پہنچنا ضرور تھا۔ اس لئے یہ طے کیا۔ کہ واپسی کے وقت پیرس کو اچھی طرح دیکھ لیں گے۔ ڈاکٹر نہاد رشاد جو حکومت انگورا کے نمائندے ہیں۔ اور جن کا نام ہم محمد علی سے سُن چکے تھے۔ پیرس میں موجود نہ تھے۔ بلکہ لندن میں تھے۔ البتہ خلیل خالد بے (جو ایک زمانہ میں ہندوستان میں ترکی سفیر کی حیثیت سے رہتے تھے۔) وہاں موجود تھے۔ ان کے علاوہ چند دوسرے ترک احباب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ موسیو والدام ایک ترکی النسل مسلمان ہیں۔ مگر فرانس میں زیادہ رہنے کی وجہ سے اچھے خاصے فرانسیسی ہو گئے ہیں۔ اسلام کے بڑے پرجوش فدائی ہیں۔ میں نے اس سفر میں جو کچھ حاصل کیا۔ اس میں سب سے زیادہ موسیو والدام کی محبت و دوستی ہے۔ جس کا نقش ہمیشہ میرے دل پر باقی رہے گا۔ تصنع سے پاک۔ ہر وقت اسلامی خدمات انجام دینے پر آمادہ و تیار۔ ایسے خاموش کام کرنے والے بہت کم ملتے ہیں۔ اس زمانہ میں صاحب موصوف قوم پرست ترکوں کے اخبار اِنگوڈی اسلام کے اڈیٹر تھے۔ جو پیرس سے ہفتہ وار شایع ہوتا ہے۔ دو دن کے مختصر مقام میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اور آئندہ کے لئے ایسے باہمی مراسم کی بنیاد قائم ہو گی۔ جو مجھے بہت عزیز ہیں۔ یورپ کے اخبار نویسوں سے پہلا واسطہ پیرس میں پڑا۔ میں غریب ہندوستانی

کا اخبار نویس اُن لوگوں کے عزم اور کوشش کو دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ صبح سے شام تک وہ ہوٹل کو گھیرے ہوتے تھے۔ کہ اگر ملاقات نہ ہو تو آتے جاتے کسی کالے آدمی کی ایک تصویر ہی کھینچ لیں۔ سیٹھ چھوٹانی صاحب نے اخبار نوور کے نمائندے کو ایک مختصر بیان بھی دیا۔ جس کو دوسرے ہی دن اخبار مذکور نے حسب ذیل الفاظ میں شایع کر دیا:-

"مسٹر چھوٹانی پریذیڈنٹ سنٹرل خلافت کمیٹی کو جو ایک بہت بڑے سوداگر ہیں۔ اور تحریک خلافت کے لیڈر ہیں۔ برطانوی وزیر اعظم نے مشرق قریبہ کی کانفرنس کے سلسلہ میں طلب کیا ہے"۔

جب دوسرے دن ہم لوگ روانہ ہونے لگے۔ تو اسٹیشن پر بھی اخبار نویسوں کا ایک اچھا مجمع تھا بہت سے فوٹوگرافر بھی ان کالے آدمیوں کی تصویریں لینے کے لئے تیار آئے تھے۔ ہم سب بلا بلا کر کھڑے کئے جاتے تھے۔ اور بار بار کھینچے جاتے تھے۔ میں اپنے احباب کی اداؤں میں محو تھا۔ کوئی صاحب جلدی جلدی ٹائی درست کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی کوٹ کی آستینوں پر بھی نظر ہے مگر گوشہ چشم سے یہ بھی دیکھتے جاتے ہیں۔ کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ کوئی صاحب مونچھوں کی نوک کو صحیح اور مناسب زاویہ پر قائم کرنے کی سعی فرما رہے تھے۔ کوئی بزرگ اپنے چہرہ پر ایک گہرے تدبر کی شان پیدا کرتے تھے۔ ایک دوست کچھ نہیں تو ایک سنجیدہ مسکراہٹ کا نقش لبوں پر ثبت کرنا چاہتے تھے۔ غرض یہ کوششیں قابل دید تھیں! پھر لندن میں وہ انتظار کہ فرانسیسی اخبارات آئیں تو ان میں اپنی تصویریں دیکھیں! مگر یہ نہ سمجھئے۔ کہ اس میں خود بینی و خود نمائی کو ذرا بھی دخل تھا۔ اس قسم کے عامیانہ جذبات برطانوی وزیر اعظم کے معزز مہمانوں کی شان کے شایاں کب تھے۔ یہ تو سب خلافت کے لئے "پروپیگنڈا" تھا۔

اس شہرت و نمود کا مقصد تو بیحد نیک اور سعید تھا یعنی کہ یہ نمائش خلافت کے کام میں شخصیتوں کو زیادہ موثر اور وزنی بنادے! پس جو کوئی اعتراض کرنے کا ارادہ فاسد رکھتا ہو وہ اپنی زبان بند رکھے!

کیلے سے ڈوور تک پھر ایک چھوٹے سے اسٹیمر میں سفر کرنا پڑا۔ اور گو یہ اندیشہ تھا۔ کہ حسب معمول آبنائے متلاطم ہوگا۔ لیکن بہت آرام سے گزر گئے اور ۶ مارچ کی شام کو بعد مغرب سلطنت برطانیہ کے دارالسلطنت کی دم گھونٹنے والی سرد تاریکی میں جا پہنچے۔ اسٹیشن پر احباب کا ایک بڑا مجمع ہمارا منتظر تھا۔ مسٹر شعیب قریشی۔ اور عبدالرحمٰن صدیقی جن سے ملنے کی خوشی نے سفر کی تمام کلفتوں کو دل سے بھلا دیا تھا۔ موجود تھے۔ ترکی وفود کی جانب سے ہزایکسلنسی جامی بے اور ڈاکٹر نہاد رشاد اسٹیشن پر تشریف لائے تھے۔ اور اس خالص برادرانہ محبت سے ملے۔ جس سے باوجود مسلسل مصائب و آلام ترکوں کی فطرت کبھی خالی نہیں ہوسکتی۔ لندن کے اکثر احباب مسٹر اصفہانی، مسٹر ملک۔ مسٹر سید حسین وغیرہ کو بھی اسٹیشن پر پایا۔ دوستوں نے پہلے ہی سے ایک اچھا مکان تجویز کر لیا تھا۔ اور ہماری جماعت (جس میں سے میں نے اور سیٹھ چھوٹانی صاحب نے تو پہلی دفعہ لندن کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔) قیام گاہ پر پہنچ گئی*

مسٹر حسن امام اور ہز ہائنس سر آغا خاں صاحب نے مارسیلز سے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ ایک دو دن پہلے ہی لندن پہنچ چکے تھے۔ اور غالباً وزیر ہند سے مل بھی چکے تھے۔ اب کہ سب لوگ لندن میں یکجا ہو گئے۔ پہلی فکر یہ تھی کہ بارگاہ وزارت عظمٰے سے یہ پتہ چلے۔ کہ آخر یہ غلام غلاماں کیوں طلب فرمائے گئے ہیں۔ ایک عرصہ کی بے اعتنائیوں اور بے نیازیوں کے بعد ان نوجہانت کریمانہ کی ضرورت کیوں پیش آئی مجھے اس سفر میں غالب مرحوم کا یہ شعر اکثر

یاد آیا کرتا تھا۔ کہ

ہم تک نہ اُس کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!

لیکن ہز ہائینس سر آغا خان اور سید حسن امام صاحب سے وزیر ہند کے متعلق بے حد اُمید افزا افسانے سنے تھے۔ اور کبھی کبھی یہ واہمہ پیدا ہوتا تھا۔ کہ "شاید کہ ہمیں بیضہ برآرد پروبال"۔

لندن

چلا ہے اے دلِ راحت طلب کیوں شادماں ہوکر
زمینِ کوے جاناں رنج دے گی آسماں ہوکر

برطانیہ عظمیٰ کے دار السلطنت کا پہلا نظارہ میرے دل پر سوائے اس کے کوئی اثر نہ کر سکا۔ کہ ایک کالا آدمی اس سرزمین آزادی و حریت میں بھی غلاموں کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو قوم دعویٰ کرتی ہے۔ کہ اس نے ۱۹ ویں صدی عیسوی میں دنیا سے غلامی کا نام ونشان مٹا دیا۔ اس کی سلطنت کے ہر چپہ پر اقتصادی معاشرتی۔ تمدنی اور سیاسی غلامی کی بدترین کیفیات اہل نظر کے لئے عبرت آموز ہیں۔ غلامی کا کریہ منظر دیوتا طاقت اور مادیت کے ہر مندر اور شوالہ میں بدستور موجود ہے۔ سوائے اس کے۔ کہ اب اُس کو زیادہ خوش آیند اور نظر فریب لباس پہنا دیا گیا ہے۔ اس سرزمین حریت میں میں نے ہر قدم پر اپنی غلامی کے نشان دیکھے۔ سڑکوں پر۔ ہوٹلوں میں۔ باغوں میں۔ ریل میں۔ جہاز پر۔ وزارت ہند کے شاندار دفتر میں۔ وزیر اعظم کے ایوان حکومت میں۔ ہر جگہ محکوم قوم کی

ذلت و رسوائی اُس کا پیچھا کرتی ہے۔ لندن سے تعلق خاطر تو پہلے بھی کبھی نہ تھا۔
الحمد للہ! لیکن جتنے دنوں وہاں رہا۔ اس در و دیوار سے میری بیگانگت بڑھتی
ہی رہی۔ لندن کے در و دیوار کا حال لکھنا فضول ہے۔ کسی ہندوستانی بھائی کو
یورپ کے دیکھنے کا شوق ہو۔ روپیہ ضرورت سے زیادہ جیب میں ہو ہنگامہ زندگی
سے فرصت ملے۔ تو وہ ضرور ایک سفر کریں۔ مگر یہ یاد رکھیں۔ کہ برطانوی زندگی
ایک آئینہ ہے جس میں کالا رنگ کچھ اور زیادہ کالا ہی نظر آتا ہے! دُنیا کے
آثار قدیمہ دیکھنے ہوں۔ تو رومتہ الکبریٰ کے عبرت انگیز کھنڈر دیکھیے۔ جس کے ایک
ایک چپہ پر ہزاروں برس کی تاریخ کے نقوش ثبت ہیں۔ مناظر قدرت دیکھنے
ہوں۔ تو سوئزرلینڈ کی روح پرور وادیوں میں کچھ وقت گزاریئے۔ صنعتی اور تجارتی
زندگی کے مسائل کا مطالعہ کرنا ہو تو جرمنی کا عزم کیجئے۔ اور اگر فطرت انسانی
کی ادنیٰ اور اعلیٰ شعریت دیکھنا ہو۔ تو فرانس جائیے۔ انگلستان ان میں سے ہر چیز
سے محروم ہے۔ الا تدبر و سیاست۔ جہاں گیری و جہانبانی۔ جس کو فطرت انسانی
کا ایک غیر جانبدار کچھ اَور کہتا ہے۔ القصہ میں نے یہ ایک سیاح کی حیثیت سے
لندن کو دیکھا نہ کبھی یہ خیال آیا۔ کہ اس سرزمین پر ضرورت سے زیادہ ایک
دن بھی قیام کیا جائے۔ ایک دن خدا جانے کیا دل میں آئی۔ کہ مسٹر عبدالرحمٰن
صدیقی کے ساتھ ویسٹمنسٹر ایبی کو دیکھنے چلا گیا۔ تاریخی حیثیت سے ایک سیاح
کے لئے یہ مقام یقیناً دلچسپ ہے۔ اس لئے کہ ایبی کی شاندار عمارت میں کہیں
کہیں ابھی تک اُس کلیسا کے آثار قدیمہ بھی موجود ہیں۔ جس کو مبلغین مسیحیت نے
سب سے پہلے سنہ ۶۱۰ عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ عمارت کے اس پرانے حصہ میں
جاکر راہبوں کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں اور اسقفوں کے بڑے بڑے کمرے جنکی
دیواریں ابھی تک کھڑی ہوتی ہیں۔ انگلستان کے اُس تاریک عہد قدیم کو یاد

دلاتے ہیں۔ مسٹر عبدالرحمٰن چونکہ خود تاریخ کا عالمانہ ذوق رکھتے ہیں۔ اس لئے مجھ سے بھی متوقع تھے۔ کہ ہر ہر قدم پر مشاہیر کی قبروں اور یادگاروں کو بغور دیکھوں گا۔ عمارت کی خوبیوں پر نظر ڈالوں گا۔ صدیوں کی پرانی اینٹوں کے پاس ٹھہر ٹھہر کر سکسن قوم کی ابتدائی تاریخ کو دُہراؤں گا۔ بیچارے بار بار مختلف چیزوں پر توجہ دلاتے تھے۔ دیکھو یہ چوسر اور ٹینی سن کی قبریں ہیں۔ دیکھو۔ یہ شیکسپیر۔ جانسن۔ بٹلر۔ ملٹن۔ ڈرایڈن۔ اڈیسن۔ گولڈاسمتھ۔ شریڈین۔ سودی اور تھیکری کے مجسمے ہیں۔ ادہر آؤ۔ یہ مکالے اور ڈکنس کی یادگاریں ہیں۔ یہ دیکھو یہ پٹ کا نشان ہے۔ یہ ایڈورڈ دی کنفسر اور ہنری ہشتم کی عبادت گاہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ چلتے چلتے برطانوی جمہوریت کے پُرانے نشانات پر نظر پڑ گئی۔ پارلیمنٹ کے ابتدائی اجلاس۔ سو برس پہلے کہاں منعقد ہوتے تھے۔ اُس زمانہ میں ملک کی عدالت عالیہ کہاں اجلاس کرتی تھی۔ چارلس اوّل کو سزائے موت کا حکم کہاں سُنایا گیا تھا۔ کرامول نے کس جگہ پارلیمنٹ کو درہم برہم کیا تھا۔ وارن ہیسٹنگز کے مقدمہ کی سماعت کہاں ہوئی تھی۔ بیچارے صدیقی صاحب تقاضے کر کے دکھاتے تھے۔ کہ دیکھو اس کھڑکی کے شیشے فلاں صدی میں لگائے گئے تھے۔ یہ محراب فلاں شخص نے بنائی تھی۔ یہ مجسمہ فلاں شخص نے نصب کیا تھا۔ مگر آخر کار میری بے توجہی نے ان کے اصرار کو شکست فاش دی۔ وہ میری جہالت پر کشیدہ خاطر ہوئے۔ اور میں اُن مردہ مشاہیر اور آپ کے دیرینہ مکینوں کی صحبت سے اکتا کر بھاگا۔ آخر پھر میں نے کبھی کسی مشہور عمارت کے دیکھنے کا نام نہ لیا۔ مجھے معلوم تھا۔ کہ لنڈن کا رقبہ معہ ملحقات ۷۰۰ مربع میل ہے۔ اور اس کی آبادی ۷۲ لاکھ کے قریب ہے۔ مگر وہاں کی ایک بالشت زمین بھی میرے حصّہ میں نہ تھی۔ پھر میں کیا دیکھتا۔ کئی دفعہ خیال آیا۔ کہ ایک دن پارلیمنٹ کا اجلاس دیکھ لیں جہاں

ہندوستان کی قسمت کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ یہ کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ مگر میں نے سوچا۔ کہ میں وہاں جاکر کیا دیکھوں گا۔ اور کیا سنوں گا۔ ہندوستان کے سویلین اور فوجی حکام کے دو سو چار سو بھائی نظر آئیں گے۔ جو معاملات ہندوستان کے متعلق صرف رائے دیتے وقت "ہاں" یا "نہیں" کہہ دیا کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ کہ ان کے چند ہزار اعزا اور احباب ۳۲ کروڑ انسانوں کے گلہ بان ہیں! غرض وہ بھی نہ دیکھا۔ البتہ وزارت ہند کے دفتر میں اور نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ یعنی وزیراعظم کے دولت کدہ پر دو تین دفعہ بضرورت اور بادل ناخواستہ حاضر ہونا پڑا۔ بس لندن کی سیاحی تمام! ہاں ان کالی آنکھوں نے اتنا قصور ضرور کیا۔ کہ غروب آفتاب کے بعد کبھی کبھی ہائیڈ پارک۔ پکڈلی اور آکسفورڈ اسٹریٹ کے ہنگاموں کو بھی ایک نظر دیکھا۔ جہاں یورپین زندگی کا ایک دوسرا رُخ بیحجاب نظر آجاتا ہے۔ سو وہ کوئی انگلستان کی خصوصیت نہیں ہے۔ یورپ کے اکثر ممالک اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں؎

ایں خانہ تمام آفتاب است!

ان کے تعیش اور اخلاقی آزادی کا معیار ایشیا سے بالکل مختلف ہے اس لئے ایک کالے آدمی کو یورپین فطرت کی ان رموز و غوامض پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی زندگی کے بُرے بھلے دستور العمل کو ٹھیس نہ لگے تو سمجھئے کہ بسا غنیمت ہے!

آغاز کار

لندن پہنچنے کے بعد ابھی وزیر ہند یا وزیراعظم سے ملاقات کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ کہ لندن کے اخبار والوں نے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ صبح سے شام تک اخبارات کے درجنوں نمائندے آتے تھے۔ اور بدنصیبی سے چونکہ میں وفد کا سکرٹری تھا۔ اس

لئے زیادہ تر مجھی کو مورچے پر رہنا پڑتا تھا۔ ان سے باتیں بھی کروں۔ بحث بھی کروں ٹالنے کی ضرورت ہو تو ٹالوں۔ ہر شخص کی حیثیت کا صحیح اندازہ کروں۔ پھر اُسی اندازہ کے مطابق اُس سے باتیں بناؤں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ انگلستان کے اخبار نویسوں کی ایمانداری یا بدنیتی کے متعلق کچھ بھی کہا جائے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ اپنا کام خوب کرتے ہیں۔ ممکن نہیں۔ کہ کوئی کم و بیش ممتاز شخصیت لندن میں آئے۔ اور چند گھنٹے کے اندر اخبار والے اس کا پتہ نہ چلالیں۔ پھر وہ کتنا ہی بچنا چاہے۔ گھر پر۔ سڑک پر۔ ریل کے اسٹیشن پر۔ کہیں نہ کہیں اُس سے دو باتیں ضرور کرلیں گے۔ اور اگر کوئی شخص خود اخباری شہرت حاصل کرنا چاہے اور جیب میں روپیہ رکھتا ہو تو اس کے لئے ہر قسم کی آسانیاں موجود ہیں۔ شاید معدودے چند ایسے اخبارات ہوں۔ جو زر بر سر فولاد نہی نرم شود کے کلیہ سے مستثنےٰ ہوں۔ ورنہ جتنے اخبارات ہیں۔ ان کو روپیہ دیجے اور اپنی شخصیت کا اشتہار شایع کرالیجئے۔ تاہم یہ امر میری نظر میں کہ میں خود بھی اخبار نویسی کے ابجد سے روشناس ہوں یقیناً قابل تحسین ہے۔ کہ لندن کے اخبار نویس خبروں کی اشاعت کے متعلق اپنا فرض ایسی تندھی سے ادا کرتے ہیں۔ جس کا ہندوستان کے اخبار نویس کسی طرح صحیح اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ ان اصحاب کے حملوں سے میں تو بعض اوقات اس قدر پریشان ہو جاتا تھا۔ کہ اِدھر اُدھر منہ چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ سب سے زیادہ مشکل یہ تھی۔ کہ وہ ہمارے مقاصد کے متعلق سوالات کرتے تھے۔ اور یہاں اراکین وفد نے طے کردیا تھا۔ کہ ابھی اخبارات میں ہماری طرف سے ایک حرف شایع نہ ہو۔ پھر نہ صرف اخبار والے بلکہ تجارت پیشہ اصحاب بھی سیٹھ چھوٹانی سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ میں ہمیشہ سے ملنے جلنے اور عام طور پر ہر شخص سے بہت سی باتیں کرنے کا چور رہوں۔ بڑے بڑے مجموں میں مجھ

سے بیٹھا نہیں جاتا۔ اپنے دوست احباب کی تعداد ہمیشہ نہایت محدود رہی۔ رسمی گفتگو سے جی اُلجھتا ہے۔ ظاہری اخلاق ایک فن ہے۔ جو مجھے نہیں آتا۔ حتیٰ کہ ناواقف اصحاب کو اکثر مجھ پر بددماغی کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن اس دفعہ تو عمر بھر کی کسر نکل گئی۔ اپنے دوستوں سے کہتا ہوں۔ کہ اگر خاص قسم کی قابلیت نہ رکھتے ہوں۔ اگر میٹھی میٹھی مگر محض فضول اور بے معنی باتیں کرنی نہ آتی ہوں اگر (مرحوم علی گڑھ کی اصطلاح میں) "جُبنانیت" کا کافی مادہ موجود نہ ہو تو کبھی بھول کر بھی کسی وفد کے سکرٹری نہ بنیں! اس زمانہ میں ایک ایسے عہدہ دار کے لئے چند خصوصیات لازمی ہیں۔ میٹھا ہو۔ ضرورت کے وقت نرم اور گرم بن سکے۔ موقعہ ہو تو رعب بھی جما سکے۔ جھوٹ اگر اچھی طرح نہ بول سکتا ہو تو کم از کم یہ قابلیت تو ضرور ہو کہ کسی مباحثہ میں اپنا پلہ ہلکا نہ ہونے دے۔ اور جب یہ خطرہ پیش آئے۔ تو شاندار الفاظ۔ مرعوب کرنے والے لہجہ اور دیگر حرکات و سکنات سے اس کمی کو پورا کر دے۔ علاوہ بریں یہ بھی ضروری ہے۔ کہ کندھا یا کہنی مار کر ہمیشہ آگے کی صفوں میں گھس جایا کرے۔ اگر یہ نہیں تو پھر چاہیے خدمتگار یا جہاز کا خلاصی بن کر یورپ چلا جائے۔ مگر کسی وفد کا سکرٹری بن کر ہرگز ہرگز نہ جائے۔ وہ دُنیا ہی کچھ اور ہے۔ ہم جیسوں کے بس کی نہیں! ایک اور مصیبت بھی تھی۔ میں خزانہ کا سانپ بن گیا تھا۔ یوں تو ہمارے لندن پہنچتے ہی دُور دُور کے رفقا و احباب جمع ہو گئے۔ مگر بیشتر یہ حالت تھی۔ کہ ہر ہمدرد دوست جو ملنے آتا تھا۔ اس کی نظر سیٹھ چھوٹانی کی جیب پر پڑتی تھی! لوگ سمجھتے تھے۔ کہ وفد آیا ہے۔ لاکھوں لایا ہوگا۔ پھر خود سیٹھ صاحب کا وزن بھی بحساب زرِ سرخ کچھ کم نہ تھا اچھے اچھے خوش پوش بظاہر نہایت خوشحال۔ باتوں کو سنئے تو نہایت مزیدار۔ مگر ساری گفتگو میں گرہ کا مصرعہ وہی ہوتا تھا۔ کہ ہو سکے تو وفد یا سیٹھ صاحب

کے بنک کی کتاب کا کوئی ورق ہاتھ آجائے +

ہمدردان ورفقا کی تعداد میں ہر روز کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اس انبوہ کے اظہار اُلفت سے بھی زیادہ ترمجھ بدنصیب کو واسطہ پڑتا تھا۔ اور جو کچھ گزرتی تھی اُس کے لئے ایک مثنوی زہر عشق لکھنے کی ضرورت ہے!

لندن کا ایک مہینہ مطالعہ فطرت انسانی کے لئے ایک اچھا اور وسیع مضمون ہے۔ جو انگریز اور ہندوستانی وہاں ہم کو ملے۔ ان میں انسانیت کے عجیب عجیب نمونے نظر آئے۔ ایک اخبار نویس محمد علی صاحب کے پرانے دوست اکثر تشریف لاتے تھے۔ عموماً ہمارے کھانے کے اوقات پر وہ ضرور تکلیف فرمایا کرتے تھے ان حضرت کی فوری اور اشد ضروریات کبھی کبھی سیٹھ چھوٹانی کی لمبی اور گہری اور بھاری جیب میں چھوٹا موٹا سوراخ بھی کر دیتی تھیں۔ لیکن یہ نہ بھی ہو تو ہر روز ایک وقت کا کھانا بھی کچھ کم مرغوب نہ تھا۔ یہ حضرت ایک بہت بڑے اخبار کے نمائندے تھے!

ایک دوسرے "دوست" تشریف ارزانی فرماتے تھے۔ ہر روز نیا لباس ہوتا تھا۔ اور وہ بھی اس قدر نفیس کہ اس غریب وفد کے ایک رکن کو بھی کبھی میسر نہ ہوا ہوگا۔ لباس کی تراش قانون فیشن سے نہ ذرہ کم نہ ایک ذرہ زیادہ۔ ٹائی کا رنگ موزے کی وضع۔ دستانوں کی قطع کالر کی اُونچائی۔ پتلون کی شکن۔ ہر چیز کانٹے میں تلی۔ چھریرا جسم اور بالوں کی آلائش سے سارا چہرہ کلیتاً پاک۔ اگر کہیں بکنگھم پیلیس کے پاس مل جاتے تو میں سمجھتا۔ کہ شاید یہی پرنس آف ویلز ہیں۔ مگر ہمارے یہاں کے کھانے کی گھنٹی اور سیٹھ چھوٹانی کے بنک کی کتاب انہیں بھی بہت پیاری معلوم ہوتی تھی۔ لباس۔ وضع اور قطع یہ سب تو اُسی "فن" کے متعلق ضروری "دا ئن" تھیں۔ غرض اس فہرست میں بہت سے

نام ہیں! ان واردات سے قطع نظر۔ اصل داستان شروع کرتا ہوں +

لندن پہنچنے کے دو تین دن بعد تمام اراکین وفد نے وزیر ہند کو رسمی اطلاع دی۔ کہ ہم حاضر ہیں۔ اس کے بعد یہ انتظار تھا۔ کہ وزارت عظمیٰ کے در دولت پر کب طلب کئے جائیں +

۱۱ مارچ کو پہلی ڈیوڑھی پر یعنی وزیر ہند کی خدمت میں طلب کئے گئے۔ اس تمہیدی ملاقات کے بعد دوسرے دن ۱۲ مارچ کو وزیر اعظم سے ملاقات قرار پائی +

اُس دن ۱۰ بجے ہم لوگ ہوٹل رٹز میں پہنچے۔ جہاں ہز ہائنس سر آغا خان مقیم تھے۔ ان کو لے کر پہلے وزارت ہند کے دفتر میں گئے۔ تاکہ مسٹر مانٹیگو کو بھی ساتھ لے لیں۔ گو کہ سالار وفد سیٹھ چھوٹانی صاحب اور ترجمان وفد۔ سید حسن امام صاحب تھے۔ مگر سچ پوچھئے تو جمعیت کے سپہ سالار اور اس برات کے دولہا ہز ہائنس ہی نظر آتے تھے۔ شاید اس وجہ سے کہ صاحب موصوف دفاتر حکومت کے سمندروں کے بہت بڑے پیراک ہیں اور اُونچی سے اُونچی ایڑیوں تک پہنچ سکتے ہیں +

مسٹر مانٹیگو

بہر حال اُس دن صبح کو پہلی مرتبہ میں نے مسٹر مانٹیگو کو اچھی طرح دیکھا۔ اور اس کے بعد بھی کئی بار دیکھنے اور ان کی گفتگو کو سننے کے بعد میرے قلب نے طے کر لیا۔ کہ وزیر ہند کی شخصیت بہت دلنواز اور عشوہ طراز ہے۔ دوران سفر میں سید حسن امام صاحب اور ہز ہائنس آغا خان نے وزیر ہند کی تعریفوں کے اتنے دریا بہائے تھے۔ کہ مجھ جیسا بدعقیدہ بھی اپنی جگہ سے ہلنے لگا تھا لیکن

ان کو دیکھنے اور ان کو باتیں سننے کے بعد میری راے میں اگر کوئی تغیر ہُوا تو صرف یہ کہ مسٹر مانٹیگو اپنے فن تدبر میں کچھ زیادہ سبکدست اور دلفریب ہیں! باقی اس کا تو میں نہ کبھی قایل تھا نہ ہوں۔ کہ کسی وزیر ہند یا وزیر اعظم کی عنایت سے ہندوستان اپنی کھوئی ہوئی عزت حاصل کر سکتا ہے۔ عزت تو صرف اُسی قوم کو حاصل ہو سکتی ہے۔ جو بے منت غیرے اُس کو حاصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ شرط اول یہی ہے۔ اس لئے ان فروعات پر نظر کرنا یا یہ سوچنا۔ کہ ہم پر فلاں وزیر مہربان ہے۔ اور فلاں نہیں ہے۔ بالکل بیسود ہے۔ مسٹر مانٹیگو کی ادائیں تو سب ہی دلفریب تھیں۔ مگر ایک خاص ادا تو بہت ہی دلفریب تھی۔ (ایسی دلفریب تھی۔ کہ اگر ہمارے اعتدال پسند بھائی وہاں ہوتے تو نہ جانے کتنی دفعہ شدت عقیدت کے ساتھ غش پر غش آتے!) یعنی جب وہ ہندوستان کی جدوجہد کا ذکر کرتے تھے۔ تو ہمیشہ اپنی ذات کو ہمارے ساتھ اس طرح ملا لیتے تھے۔ کہ جو تجویز یا خیال بھی ان کی زبان پر آتا اسکو جمع کے صیغہ میں ادا کرتے۔ یوں کہ "اب ہم کو یہ کرنا چاہئے" "وزیر اعظم سے ہم کو یہ کہنا چاہیئے" "ہم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے" وغیرہ وغیرہ جتنے "ہم" استعمال ہوتے۔ ان سب میں وزیر ہند اپنی شخصیت کو اراکین وفد کے ساتھ برابر کا شریک قرار دیتے تھے! "یہ نصیب اللہ واکبر لوٹنے کی جائے ہے" چہرہ پر مسکراہٹ ہے۔ جو دوسروں کے دل تک پہنچتی ہے۔ زبان میں لوچ ہے جو مخاطب کو یقیناً متاثر کرتا ہے۔ طرز گفتگو کچھ ایسا وسیع اور عام ہے۔ کہ بحیثیت مجموعی (اگر ان کی گفتگو کے اجزا الگ الگ نہ کئے جائیں) بہت ہی اُمید افزا نظر آئے۔ لیکن اگر کہیں اس گفتگو کا تجزیہ کیجیے تو پھر ماحصل عنقا ہے! صاحب وزیر ہند۔ ہندوستانی لوگوں کے ساتھ اپنی ہمدردیوں کا اظہار اس قدر بے تکان اور فی البدیہ کرتے ہیں۔ کہ

تفصیلی گفتگو کی گنجائش بہت ہی کم باقی رہ جاتی ہے۔ وزیر اعظم سے ہماری دوسری ملاقات میں صاحب موصوف شریک نہ تھے۔ غالباً دار العوام کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اور اس میں ان کی شرکت ناگزیر تھی۔ لیکن جب ہم ملاقات کے بعد وزیر اعظم کے کمرہ سے نکل رہے تھے۔ تو مسٹر مانٹیگو بھی صرف نتیجہ دریافت کرنے کے لئے آپہنچے۔ اور جب یہ سُنا کہ ہم مایوس جا رہے ہیں۔ تو باوجود عدیم الفرصتی کے چند منٹ ٹھہر گئے۔ اور ہم سب کو اطمینان بخشا کہ "خواہ ہماری جدوجہد طویل ہو مگر ہم ضرور کامیاب ہوں گے" حسب معمول ہم اور ہمارے کی وسعت وہی تھی۔ کہ خود آنجناب کی ذات بھی ہمارے ساتھ بدرجہ مساوی شریک سمجھی جائے! بعض اراکین وفد سے رخصتی ملاقات میں تو یہاں تک ارشاد ہوگیا۔ کہ ہندوستان میں جدوجہد جاری رہنی چاہئے۔ کبھی نہ کبھی ضرور کامیابی ہوگی! یہ ستم ظریفی کس قدر دلفریب ہے۔ اُدھر ارشاد ہوتا ہے۔ کہ ہاں بڑھے چلو۔ اور اِدھر حکومت ہند کی باگ ڈھیلی کی جا رہی ہے۔ کہ اہل ملک کی جدوجہد کے تمام دروازے بند ہو جائیں۔ اس ساری سرگزشت کی معنی بین السطور کیا ہیں!

اس طرز تحریر سے یہ سمجھنا ضرور نہیں۔ کہ میں کسی حالت میں مسٹر مانٹیگو کی ہمدردیوں پر ذرا بھروسہ بھی نہیں کرتا۔ مگر جو اصحاب ان ہمدریوں کو قومی جدوجہد کے پلے میں ایک بڑا وزن سمجھتے ہیں[1]۔ وہ میرے خیال میں یا تو محض سادہ لوح ہیں یا قصداً واقعات وحقائق سے انکار کر رہے ہیں۔ اپنے پلہ میں اپنے ہی وزن کی ضرورت ہے۔ مانگے ہوئے وزن کا وجود کچھ نہیں۔ علاوہ بریں ہم نے اب تک

[1] وزن کا حال تو یہ ہے۔ کہ وزیر اعظم نے بیک اشارہ ابرو اپنی مصلحتوں کی قربان گاہ پر مسٹر مانٹیگو کو ایک بکرے کی طرح چڑھا دیا۔ اور ہم تو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے۔ کہ مسٹر لائیڈ جارج کے سامنے وزیر ہند ایک دفتر کے ہیڈ کلرک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

جناب وزیر ہند کی تمام ہمدردیوں کا صرف ایک نتیجہ دیکھا ہے۔ یعنی نام نہاد تجویز اصلاحات۔ وہ نتیجہ آج عملی حیثیت سے ہمارے سامنے موجود ہے۔ اُسکی اصلی قیمت سطح پر صاف نظر آرہی ہے۔ کچھ کلام ہو تو جدید کونسلوں کی روئیدادوں کو ایک دفعہ بغور پڑھ جائیے۔ غیر سرکاری ممبران کے اُن ریزولیوشنوں کو دیکھئے جن کے پیش کرنے کی اجازت نہیں ملی یا جو کونسلوں میں باوجود مفروضہ غیر سرکاری اکثریت کی کثرت رائے سے نامنظور ہوئے۔ اُن سوالات پر نظر کیجئے۔ جو پیش ہوئے اور مسترد کر دیئے گئے۔ یا ایسا جواب پایا۔ جس کے کوئی معنی نہیں ہوتے ہمیں ابتک مسٹر مانٹیگو کی ہمدریوں سے جو کچھ حاصل ہُوا ہے۔ اس کی میزان کل یہ کونسلیں ہیں۔ اور ان کونسلوں کی ساری حقیقت بس اتنی ہے ا رہیں زبان کی دلفریب گلکاریاں۔ ان سے مسٹر سید حسن امام یا ہز ہائینس آغا خاں اور بعض دوسرے احباب کتنے ہی متاثر کیوں ہوں۔ مگر وہ بھی یہ نہیں بتا سکتے ہیں کہ اس اخلاق کریمانہ سے ہم کو اپنے مقاصد میں کہاں۔ کب۔ اور کتنی اعانت حاصل ہوئی میں نے مسٹر مانٹیگو کی شیریں زبانی سے نہ کبھی دھوکہ کھایا نہ آج ان کی سرد مہری کا شکوہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نہیں کہتا۔ کہ مسٹر مانٹیگو کی شیریں بیانی صرف دھوکہ دینے کے لئے اس قدر شیریں تھی۔ یا یہ کہ نیت دھوکہ دینے کی ہوتی تھی۔ مگر یہ اخلاق اس مُفلس کا اخلاق ہے۔ جس کی جیب میں پیسہ نہیں مگر سایل سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ انکار کی جرأت نہیں اور اقرار کی اہلیت مفقود۔

البتہ ازروے انصاف اراکین وفد کو ذاتی طور پر مسٹر مانٹیگو کے شریفانہ اخلاق کا مشکور ہونا چاہیئے۔ کہ انہوں نے ہمارے ساتھ ظاہری اخلاق میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس زمانہ میں جب کہ خود اپنے وطن میں سید حسن امام جیسے مقتدر

اصحاب سے ایک معمولی انڈر سکرٹری گستاخی کر سکتا ہے۔ اور اچھے اچھے شرفا صاحب ضلع کی کوٹھی پر دھوپ میں سوکھا کرتے ہیں۔ وزیر ہند کا یہ اخلاق شریفانہ یقیناً قابل شکریہ ہے۔ لیکن ان کی شان میں قصاید تصنیف کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی +

وزارت ہند کے دفتر میں وزیر ہند کی کونسل کا کمرہ نہایت سادہ ہے۔ اسی کمرہ میں ہم بیٹھے رہے۔ تاآنکہ ہز ہائینس آغا خان مسٹر مانٹیگو کسی دوسرے کمرہ سے لے کر آئے۔ اور ہم سب کا تعارف کرایا۔ اب گویا وزیر ہند کی سرکردگی میں ہماری جماعت نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ کی طرف چلی۔ چونکہ وزیر اعظم کا مکان دفتر ہند سے ملا ہوا ہے۔ اس لئے عمارتوں کے اندر ہی اندر ہم وہاں تک پہنچ گئے۔ وقت مقررہ پر اراکین وفد کو وزیر اعظم نے طلب فرمایا۔ سب سے پہلے وزیر ہند نے ہر شخص کو وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے بعد ہم سب ایک بیضاوی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ اس طرح کہ ایک طرف وزیر اعظم مسٹر مانٹیگو اور مسٹر بونر لا بیٹھے۔ اور دوسری طرف تمام اراکین وفد۔ اور ان کے کاغذوں سے لدے ہوئے بستے اور کتابیں!

مسٹر لائڈ جارج

عمر ستر برس سے کیا کم ہوگی۔ مگر چہرے کی سرخی اور جسم کی ساخت ہندوستان کے بہت سے نوجوانوں کو شرما دے گی۔ جنہوں نے سرکاری یونیورسٹیوں پر جوان ہونے سے پہلے ہی اپنی جوانی نثار کر دی ہے۔ بشرہ سے طبیعت کے سارے جوہر صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ آنکھیں چھوٹی ہیں۔ مگر غیر معمولی چمک

رکھتی ہیں۔ اُوپر کے ہونٹ پر بالوں کی ایک گھنی کیاری ہے۔ قد میانہ بلکہ اس سے بھی کچھ پست ہے۔ سر کے بال کم ہیں۔ مگر جو ہیں وہ گردن کی طرف ہندوستان کے قدیم وضع کی مثل لٹکے ہوئے ہیں۔ فی الجملہ یہ سراپا شاعر کے لئے دلفریب نہ ہو۔ برطانیہ کی محکوم اقوام کے لئے دلکش نہ ہو مگر علم النفس کے رموز و غوامض پر غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لئے یقیناً ایک اچھا مُضمون ہے" +

ہم لوگوں کے بیٹھتے ہی پہلا جملہ جو مسٹر لائڈ جارج کی زبان سے ادا ہوا۔ میری نظر میں انکی شخصیت کا ایک اچھا عکس ہے۔ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے جلد جلد ہم سب کے حلیہ کو جانچتے اور پڑتالتے ہوئے گھنی مونچھوں کے سائے میں کچھ کچھ مسکراتے ہوئے فرمایا۔ کہ "حضرات آپ کو معلوم ہے۔ کہ آپ کہاں بیٹھے ہیں۔ یہ وہ کمرہ ہے۔ جس میں سلطنت برطانیہ کی مجلس وزرا کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں"! ایک ادائے تفاخر۔ ایک کیف پندار۔ مرعوب و متاثر کرنے کی ایک بے ہنگام کوشش۔ اس ایک فقرے نے میرے سامنے برطانوی وزیر اعظم کی شخصیت کو مصور پیش کر دیا۔ گویا فرماتے ہیں۔ کہ ہندوستانی غلام کے لئے اس سے زیادہ کون سا واقعہ مایۂ فخر و مباہات ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اپنے وجود حقیر کو سلطنت برطانیہ کی وزارت عظمیٰ کے ایوان اجلاس میں بیٹھا ہُوا پائے۔ "اے غلامو! دیکھو۔ آج تمہیں کیسی عزت نصیب ہوتی"؟ ایک غلام کے غلامانہ دماغ کے لئے یہ تخیل گویا جنت النعیم کا تخیل ہے! بساط تدبیر کے اس شاطر کی پہلی چال جس نے یورپ کے بہترین سیاسی دماغوں کو شکست دی ہے۔ حتیٰ کہ جمہوریہ امریکہ کے صدر کو بھی معہ اپنے تمام بلند آہنگ اخلاقی اصولوں کے میدان سے فرار پہ مجبور کر دیا۔ کس قدر بھونڈی اور بے ہنگام تھی۔ دوسری اس سے بھی زیادہ۔ یعنی ابھی صرف تمہیدی گفتگو شروع ہوئی تھی۔ اور سید

حسن امام صاحب نے اراکین وفد کی جانب سے رسمی شکریہ کے محض چند الفاظ ہی ادا کئے تھے۔ کہ برطانوی وزیر اعظم نے سید صاحب ممدوح کی تعریف و توصیف کے دریا بہا دیئے۔ شاید ابھی بیچارے سید صاحب نے پانچ منٹ بھی تقریر نہ کی ہوگی۔ کہ مسٹر لائیڈ جارج کی شیریں بیانی اُن پر ٹوٹ پڑی۔ سرکاری روئیداد میں وہ الفاظ کم و بیش کر دیئے گئے ہوں۔ مگر میرے دماغ میں وزیر اعظم کی اس ادا کے نقوش بجنسہٖ موجود ہیں۔ فرمانے لگے۔ کہ مسٹر حسن امام آپ نہایت قابلیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ کاش کہ ترک بھی اپنے معاملہ کو اسی قابلیت سے پیش کر سکتے افسوس کہ ان کو آپ جیسا وکیل میسر نہیں۔ میں آپکو آپ کی قابلیت پر مبارکباد دیتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

مُبارک باد اس تقریر پر جو ابھی زبان پر نہیں آئی۔ مبارک باد اس قابلیت پر جس کا اظہار ہنوز نہ ہُوا تھا۔ مبارکباد اُس وکیل کو جس نے اپنی بحث شروع بھی نہ کی تھی! وزیر اعظم کی کمان سے تیر چلا۔ مگر وقت سے پہلے۔ اگر مقصد یہ تھا۔ کہ مسٹر حسن امام کے دماغ میں تھوڑا سا نشہ پیدا کیا جائے تو اس جام پر کیمت کے پیش کرنے میں ذرا جلدی ہوئی۔ میں ایک طرف بیٹھا ہُوا ان تعریفوں کو سُن رہا تھا۔ اور حیران تھا۔ کہ تعریف تو کی جا رہی ہے۔ مگر کس چیز کی۔ مسٹر حسن امام کی صورت کے علاوہ ابھی وزیر اعظم نے دیکھا کیا!

دوران گفتگو میں خصوصاً دوسری ملاقات کے دوران میں متعدد مسایل ایسے تھے۔ جو ہماری طرف سے پیش ہوئے اور وزیر اعظم نے فرمایا۔ کہ ترکوں نے اس بات کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح ہماری بحث کے بعض خاص خاص اجزا پر صاحب موصوف نے صرف اتنا فرما دیا۔ کہ "میں نے اس بات کو سمجھ لیا۔ I have noted it ۔ یا "میں سمجھا" I see مگر ایک خاص انداز تھا۔

جس سے ہم ہر دفعہ شکست کھاتے تھے۔ یعنی یہ کہ جب کسی مسئلہ کے متعلق ہم نے اپنی بحث پر زور دیا۔ یا ان کے کسی بیان کی تردید کی معاً وہ اُس بحث کو چھوڑ کر بلا تکلف کسی دوسرے جزو پر تقریر فرمانے لگے۔ اور پھر آخر تک ان کو یاد نہ آیا۔ کہ کس چیز کا جواب انہوں نے نہیں دیا۔ عہدنامہ سیورے کے متعلق پہلی ملاقات میں جب حسن امام صاحب نے مختلف دفعات کا حوالہ دینا شروع کیا۔ تو وزیر اعظم کی گفتگو سے صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان دفعات کے الفاظ ان کے ذہن میں نہیں ہیں۔ آخر عہدنامہ کا ایک نسخہ منگوا کر ہر دفعہ کو دیکھتے جاتے تھے۔ ہم نے سُنا تھا۔ کہ مسٹر لائڈ جارج ضروری سے ضروری اور اہم سے اہم کاغذات کو بھی اکثر نہیں دیکھتے۔ اور ان کے سکرٹری اور دوسرے وزرا اس قسم کے کاغذات کو بعض اوقات دوسرے کاغذوں کے انبار میں دبا ہُوا پاتے ہیں۔ معتبر اشخاص سے ہم نے سنا۔ کہ وزیر اعظم کی طاقت کا بڑا راز یہ ہے۔ کہ عین وقت پر زبردست تقریر فرما سکتے ہیں۔ اور بحث و مباحث میں ہر بات وقت پر سُوجھتی ہے۔ بس۔ اسکے سوا جو کچھ ہے۔ وہ ان کی قسمت ہے! حال یہ ہے کہ مسٹر لائڈ جارج سے نہ ان کی پارٹی کے سربرآوردہ اصحاب رضامند ہیں۔ نہ جمہوریت خوش ہے۔ نہ پارلیمنٹ کی اکثریت ان کو کچھ زیادہ پسند کرتی ہے۔ نہ خاندان شاہی میں وہ اچھی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ تاہم اقتدار قایم ہے۔ اور یورپ و ایشیا کی باگیں ہاتھ میں ہیں اتنک مزاج ہیں۔ اور بے پروا۔ مگر دُنیا کا سرایڑی کے نیچے دبائے ہوتے ہیں۔ دوسری ملاقات میں مسٹر حسن امام صلحنامہ سیورے کے متعلق وفد کے خیالات پیش کر رہے تھے۔ اور ابھی آبنائے باسفوس کے مسئلہ تک پہنچ کر اس بات میں کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ دفعتاً وزیر اعظم نے گفتگو کا رُخ بدل دیا۔ یہ وہی ایک ادائے خاص ہے۔ لندن کے

موسم کی طرح کہ ابھی بارش ہو رہی ہے۔ اور ابھی دھوپ نکل آتی۔ ابھی دھوپ ہے اور ابھی دھواں دھار برسنے لگا۔ وزیر اعظم بھی گفتگو کا ایک شاہانہ انداز رکھتے ہیں۔ جہاں جی چاہا گفتگو ختم کر دی۔ اور جس مسئلہ پر جی چاہا گفتگو کرنے لگے۔ چنانچہ مسئلہ باسفورس پر گفتگو کرتے کرتے دفعتاً مسٹر حسن امام کی تقریر کے سلسلہ کو یوں ختم کر دیا۔ کہ

"اگر آپ پسند کریں تو جانے سے پہلے میں مختصراً ان معاملات کے متعلق جو رائے برطانوی حکومت نے قائم کی ہے۔ اُس کو بیان کر دوں"۔

یہ "گریز" جس قدر فوری تھی۔ اُسی قدر ہمارے لئے مایوس کن بھی تھی۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ہمارے معروضات کو سننے کی بجائے ہم سے کہہ دیا گیا۔ کہ "اب وفد کی مزید گفتگو فضول ہے۔ برطانوی حکومت اپنی رائے قائم کر چکی۔ اُس کو سُن لیجے۔ اور تشریف لے جائیے"!

یہ جواب اس سوال کا تھا۔ جو صاف طور پر کیا جانا چاہئے تھا۔ اور نہیں کیا گیا۔ کہ آخر ہندوستان سے یہ تمام نیازمندیوں طلب کئے گئے ہیں اگر برطانوی وزیر اعظم کو صرف اپنے آخری فیصلوں کا سُنانا منظور تھا۔ تو ان غریبوں کو اس طویل سفر کی تکلیف دینی کیا ضرور تھی۔ چند سطریں گورنر جنرل کے دفتر میں بھیج دی گئی ہوتیں۔ اور بذریعہ ڈاک وفد کے تمام اراکین تک پہنچ جاتیں۔ کیا ضرور تھا۔ کہ اس دعوت کریمانہ کا احسان ان غریبوں کے ضعیف کندھوں پر رکھا جاتا۔

چونکہ واقعات اب پُرانے ہو گئے ہیں۔ اس لئے میں نے وفد کے متعلق بہت سے تفصیلی واقعات ان صفحات سے نکال دیئے ہیں۔ وہ اب تاریخ کا ایک جزو ہیں۔ اور لکھنے والا کبھی ان کو لکھے گا۔

ترکی وفود

جیساکہ اخبارات سے عام طور پر معلوم ہوا ہوگا۔ لندن کانفرنس میں دو ترکی وفود آئے تھے۔ ایک قسطنطنیہ کی حکومت کی طرف سے اور دوسرا انگورا سے جو غازی مصطفےٰ کمال کی حکومت کا نمائندہ تھا۔ دونوں وفود کے ممتاز اراکین حسب ذیل تھے:۔

وفد قسطنطنیہ	وفد انگورا
۱۔ ہز ایکسیلینسی رشید پاشا۔ سردار وفد	۱۔ ہز ایکسیلینسی بکر سامی بے۔ سردار وفد
۲۔ " " عثمان نظامی پاشا۔ رکن وفد	۲۔ " " جامی بے۔ رکن وفد
۳۔ " " داماد اسمٰعیل بے۔ "	۳۔ " " یونس نادی بے "
۴۔ شفقی بے "	۴۔ " " حسین بے "
۵۔ زغیب رئیف بے "	۵۔ " " ڈاکٹر نہاد رشاد "
۶۔ کپتان رضا بے "	۶۔ منیر بے "
۷۔ حمدی بے "	۷۔ روف احمد بے "
۸۔ لفٹنٹ کرنل قادری بے "	۸۔ اشرف روشن بے "
۹۔ قدری بے سکرٹری	۹۔ جاوید بے "

وزیر اعظم سے پہلی ملاقات کے بعد ہی ترک احباب سے ملاقاتیں شروع ہوئیں مختلف اوقات میں۔ ہم میں سے مختلف اصحاب (سوائے سید حسن امام صاحب اور ہز ہائینس آغا خان کے جو غالباً سوائے چند پبلک مواقعہ کے کبھی ترکوں کے نمائندوں سے نہ مل سکے) دونوں وفود کے اراکین سے ملتے رہے۔ اور ہمارے

لئے یہ امر دو گونہ خوشگوار تھا۔ کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں سے نہ صرف تبادلہ خیالات اور مشورہ کرنے کے خواہشمند تھے۔ بلکہ ان کی خالص اسلامی اخوت متقاضی ہوتی تھی۔ کہ جہاں کہیں ضرورت ہو۔ وہ ہمارے سامنے اپنی گذشتہ غلطیوں یا فروگذاشتوں کا بلاتکلف اعتراف کریں۔ اور آئندہ کے لئے فراخدلی کیساتھ ہمارے مشوروں کو سنیں۔ یہ ہم نے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی میں بھی ترک احباب سے صاف صاف سنا۔ اور لندن میں بھی محسوس کیا۔ کہ تقریباً تمام قوم پرست ترک کمیٹی اتحاد ترقی کے ممتاز اراکین کی اس ابتدائی غلطی کو دیکھ رہے ہیں۔ جو انہوں نے کی تھی۔ یعنی یہ کہ تحریک اتحاد تورانی کی تبلیغ و اشاعت میں اتنے منہمک ہوگئے تھے۔ کہ عالمگیر اتحاد اسلامی کے وسیع تر میدان کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ اور یہ کہ انہوں نے اتحاد تورانی کے محدود دائرہ میں اپنی بہترین کوششوں کو صرف کیا۔ حالانکہ اس وقت بھی نہ صرف ہندوستان کے مسلمان بلکہ تمام عالم اسلام اتحاد اسلامی کی ضرورت کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ سچ ہے۔ کہ ملک کے اندرونی حالات کو دیکھتے ہوئے تحریک اتحاد تورانی ایک ضروری تحریک تھی۔ اس لئے کہ ہندوستان کی طرح سلطنت عثمانیہ میں بھی مختلف المذہب لوگ آباد ہیں۔ اور ان سب کو ایک ہی قومیت کے دائرہ میں لانے کے لئے اس طرح کی کوئی نہ کوئی تحریک پیدا کرنی ضرور تھی۔ اور بلاشک اسی تحریک کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ جب ترک احرار کی فوجیں استبدادیت کے دیرینہ قلعوں کو مسمار کرنے بڑھیں تو انکی صفوں میں ہر قوم شریک تھی۔ اور ارمنی و یہودی تک شانہ بشانہ جا رہے تھے۔ یہ سب سچ ہے۔ مگر ترک احرار کے پاس اس اعتراض کا جواب نہیں۔ کہ جب ان کی قومی حیثیت محض مقامی نہ تھی بلکہ ازروے مذہب وہ تمام عالم اسلامی کی تمناؤں اور آرزوؤں کا آخری نقطہ نظر تھی۔ تو ان کو اندرونی حالات کے لحاظ سے۔ صرف ایک اسی

تحریک میں اس قدر منہمک نہ ہونا تھا۔ خصوصاً جبکہ ان کو یورپین دول کے حملوں سے بچنے کے لئے تمام عالم اسلامی کی ہمدردیاں درکار تھیں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ اتحاد اسلامی خواہ وہ یورپین احباب کی نظر میں کتنا ہی خطرناک کیوں نہ سمجھا جائے مسلمانوں کے لئے ایک جزو مذہب ہے۔ جس کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں۔ اسلامی قومیت کا سنگ بنیاد اخوت اسلامی ہے۔ اور اس عہد ابتلا میں تو تحفظ خود اختیاری کی وہی ایک دیوار ہے۔ جس کے سایہ میں ہر ملک کا مظلوم مسلمان دم لے سکتا ہے۔ جب اس حقیقت نفس الامری کو تسلیم کر لیا جائے (اور کون ہے جو گذشتہ پچاس سال کی تاریخ کو جھٹلا سکے) کہ اگر سارا یورپ نہیں تو اس کا بڑا حصہ مسلمانوں کے حاکمانہ اقتدار اور قومی آزادیوں کا دشمن ہے تو پھر معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اسلامی اقتدار کی گرتی ہوئی دیواریں کیونکر سنبھالی جائیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ یورپ کی موجودہ قومیت کا تخیل۔ اسلام کی قومیت کا تخیل نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔ یورپ نے مذہب سے بے پروا ہو کر اپنی قومیت کو جغرافی حدود کے اندر محدود کر دیا ہے۔ اُس کا سطح نظر مادیت ہے۔ نسل و مذہب تہذیب و تمدن سب اسی قومیت کے ماتحت ہیں جو حکومتوں اور سلطنتوں کے جغرافی حدود میں پرورش پاتی ہے۔ قیصر جرمنی انگلستان کے بادشاہ کا کتنا ہی قریب کا رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ مگر اس کی قومیت جرمن ہے۔ اور قومیت کے مصالح ہر حال میں خاندانی اور موروثی تعلقات پر حاوی ہیں۔ سارے یورپ کا نظام زندگی اسی تخیل پر مبنی ہے۔ لیکن اسلام کی تاریخ شاہد ہے۔ کہ گذشتہ تیرہ سو برس میں کبھی اس اصول قومیت پر اسلامی اقتدار کی عمارت تیار نہیں ہوئی یہ سچ ہے۔ کہ ایک ہی وقت میں مختلف سلطنتیں بھی تھیں۔ ان میں جنگ و جدل بھی ہوتا تھا۔ رقابتیں بھی ہوتی تھیں۔ مگر مذہبی اخوت کے حلقہ سے کوئی

باہر نہ جا سکتی تھی۔ یزید جیسا حکمران کہ اس کی مجرمانہ خود پرستی نے جگر گوشہ رسالت کے پاک خون سے اپنا دامن رنگ لیا۔ اسلامی در وبست سے باہر نہ جا سکا انفرادی حیثیت سے وہ بیشک گردن زدنی تھا۔ مگر وہ کوئی جدا قومیت قائم نہ کر سکا۔ خود ہندوستان کے اسلامی عہد میں کھلی ہوئی تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ کہ باوجود اُس جاہ وجلال کے جو مغلوں کو اور مغلوں سے پہلے دوسرے حکمران خاندانوں کو حاصل تھا۔ مسئلہ خلافت کے سامنے ہندوستان کے بڑے سے بڑے اسلامی تاجدار کا سر بے اختیار جھکتا تھا۔ بادشاہ خلیفہ اسلام کے مرسلہ خلعت و مراسلت کا استقبال کرنے شہر پناہ سے باہر نکل آتا تھا۔ حالانکہ نہ وہ سلطان ترکی کا ماتحت تھا نہ اس کا ملک عثمانی سلطنت سے قریب تھا۔ کہ حملہ کا اندیشہ ہو۔ اس راز کی کنجی یہی ہے۔ کہ اسلام نے اخوت اسلامی کا وسیع دایرہ قائم کیا جس کے اندر ہر رنگ ونسل کے مسلمان۔ ہر ملک کے رہنے والے ہر سلطنت کے تاجدار اور والی و وارث شامل ہیں۔ اس دایرہ کی حدود کو خلافت اسلامی کے نظام سے مستحکم کیا گیا۔ بڑے دائرہ کے اندر بہت سے چھوٹے دائرے بنتے اور بگڑتے رہے۔ اسلامی حکومتیں قائم ہوتی رہیں۔ اور تباہ ہوتی رہیں۔ بادشاہوں نے اپنی ملک گیری سے سلطنتوں کے جغرافئی حدود کو بدل ڈالا۔ کبھی غالب رہے اور کبھی مغلوب ہوتے۔ دنیا کا یہ کارخانہ اور یہ نشیب و فراز بدستور قائم ہے لیکن غالب و مغلوب فاتح و مفتوح بلند و پست کوئی اس دائرہ سے باہر نہ جا سکا۔ اور جب چلا گیا۔ تو پھر اسلامی دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ خلافت اس نظام زندگی کا ایک غیر متزل ضابطہ ہے جو تمام مختلف عناصر میں ربط باہمی قائم رکھتا ہے۔ دور جدید میں جب یورپ نے کبھی دوست بن کر کبھی دشمن بنکر خلیفہ اسلام کی سلطنت کے اقتدار کو تباہ کرنا شروع کیا۔ تو اُسی وقت

تمام عالم اسلامی میں اتحاد اسلامی کے بڑے بڑے داعی پیدا ہوئے مثلاً خود قسطنطنیہ میں ابوالاحرار مدحت پاشا ان کے معاصرین مصطفےٰ کامل پاشا رشید پاشا ضیا پاشا۔ علی سعاری آفندی۔ جواد پاشا۔ عمر پاشا۔ اور پھر عہد حاضر کے ترکی احرار انور، طلعت و شیخ شاویش و مارشل شفقت پاشا وغیرہ سب ایک ہی منزل کی طرف جارہے تھے۔ اور ایک ہی آواز بلند کر رہے تھے۔ ایران میں عہد انقلاب کے حریت پرست مجتہدین اور مرزا رضا کرمانی جیسے احرار کہ انہوں نے "عہد استبداد صغیر" میں آزادی و حریت کے لئے اپنا جان و مال قربان کردیا۔ اسی طرح مصر میں مفتی شیخ محمد عبدہٗ۔ علی پاشا۔ مبارک محمود شاہ فلکی۔ مصطفےٰ کامل پاشا اور ان کے جانشین اعرابی پاشا اور ان کے شرکا کار۔ ٹیونس میں شیخ محمد بیرم اور سید خیرالدین پاشا، وسط ایشیا و ترکستان میں اسمٰعیل بے۔ اور سب سے بڑا داعی حریت سید جمال الدین افغانی۔ یہ سب دشمنوں کی سازشوں کو دیکھ رہے تھے۔ اور چاہتے تھے۔ کہ قافلہ غافل نہ ہو جائے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ اسلامی قوی مضمحل ہو رہے ہیں۔ اور اس حالت میں اسلام کی عالمگیر قومیت کے مختلف اجزا اپنے اپنے مقام پر ناموس اسلامی کا تحفظ نہ کر سکیں گے۔ ان کے لئے اتحاد اسلامی کا متحدہ تخیل ہی ایک سپر ہے۔ جو دنیا میں اسلام کی عزت قائم رکھ سکتا ہے۔ اب اگر ہمارا نظام زندگی جو ہر حال میں مذہب کا تابع ہے۔ یورپ کی مادیت کا راستہ روکتا ہے۔ تو ہم معذور ہیں۔ الحمدللہ کہ وہ زمانہ گزر گیا جب ہندوستان میں بڑے بڑے بزرگان ملت Pan Islamism- (تحریک اتحاد اسلامی) کا نام زبان پر لانے کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ اچھے اچھے قوم پرستوں کو دیکھا۔ کہ وہ اس نام کو اپنی زبان و قلم سے دور رکھتے تھے۔ مبادا ہندوستان کے حاکم یا دوسرے ہموطن ناخوش ہوں۔ وہ کہتے تھے۔ کہ یہ چیز سچ اور صحیح ہے۔ مگر اس کے نام

کا نقارہ بجا کر خواہ مخواہ یورپ کو کیوں بھڑکاتے ہو +

ہم نے اس سفر میں محسوس کیا۔ کہ اتحاد اسلامی کی اصل نوعیت کو ترکوں کی ایک جماعت اب اچھی طرح سمجھ رہی ہے۔ انسان کچھ کھو کر سیکھتا ہے عربوں کی ہمدردیوں سے محروم ہو کر ترکوں کو اب معلوم ہوا۔ کہ وہ غلط راستہ پر جا رہے تھے۔ اور سچے مسلمانوں کی طرح وہ اس غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا۔ کہ یورپ کی جغرافئی قومیت جس کی تقلید انہوں نے کرنی چاہی تھی۔ مسلمانان عالم کے درد کی دوا نہیں ہے۔ مجھے پہلے یہ خیال تھا۔ کہ شاید ابھی تک ترکوں نے اپنی اس غلطی کو محسوس نہیں کیا۔ لندن میں، روما میں سویزرلینڈ میں ہر جگہ جو ترک ملے۔ ان کی نظر کو اب میں نے بہت وسیع پایا۔ نہ صرف نظر وسیع ہے۔ بلکہ قوی عمل بھی مضمحل نہیں۔ الحمد للہ! وہ ہر طرف عناصر اسلامی کے اتحاد کی فکریں کر رہے ہیں۔ مدافعانہ حیثیت سے نہ کہ جارحانہ حیثیت سے۔ بلاشبہ اسلامی قومیت سارے عالم میں کمزور ہے۔ اور کمزور کو صرف دفاع کی فکر چاہیئے درحقیقت اتحاد اسلامی تحفظ خود اختیاری کے فطری احساس کا عین اقتضا ہے۔ اس کا مقصد دوسروں پر حملہ کرنا نہ کبھی تھا نہ ہے۔ اور یوں تو ہر چیز کارساز حقیقی کی مصلحتوں پر منحصر ہے! یورپ میں جس چیز کو امپیریلزم (توسیع سلطنت و اختیارات شاہانہ) کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم مسلمانوں کے پین اسلامزم سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتا +

ہم لندن پہنچے تو ترکی وفود جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ تاہم جو کچھ وقت ملا۔ وہ باہمی تبادلہ خیالات میں صرف کیا گیا۔ نام نہاد حکومت قسطنطنیہ کا وفد تو اپنی کمزوری کے علاوہ برطانوی اثرات کے تحت میں اپنی مجبوری و معذوری کو اس قدر محسوس کرتا تھا۔ کہ اگر ہم سے دل کھول کے باتیں کرنا بھی

چاہتا ہو تو ظاہر ہے۔ کہ یہ امر اُس کے امکان سے باہر تھا۔ وہ کوئی آزاد وفد تو تھا نہیں۔ کہ اپنی قوم کے صحیح جذبات کو پیش کر سکتا۔ تاہم اس میں شبہ نہیں۔ کہ اس کے اراکین کے دلوں میں اس عہد نامہ کے کانٹے چبھ رہے تھے۔ ہم اُن کے ایک ایک لفظ سے ان کی کیفیات قلبی کا اندازہ کر سکے۔ البتہ زبان نہ تھی۔ برخلاف ان کے انگورا کا وفد زبان بھی رکھتا تھا۔ اور بازو بھی۔ بکر سامی بے کی شخصیت سے گو پہلے ہم آشنا نہ تھے۔ لیکن دو چار ملاقاتوں کے بعد بلا تکلف یہ رائے قائم کر سکے۔ کہ ان کی شخصیت کافی وزن رکھتی ہے۔ مسٹر لائڈ جارج نے تو بار بار ہم سے یہی فرمایا کہ بکر سامی بے اپنے معاملہ کو اچھی طرح پیش نہ کر سکے۔ لیکن ہم نے جب بکر سامی بے سے باتیں کیں۔ تو ہمارے لئے وزیر اعظم کی رائے سے متفق ہونا ناممکن نظر آیا۔ خود برطانوی اخبارات کے کالموں میں یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ کہ وفد انگورا کے سردار کے طرز عمل نے سپریم کونسل پر اپنا سکہ بٹھا دیا۔ اور مخالفین کو بھی تحسین و آفرین پر مجبور کر دیا۔ انگلستان کے اخبارات نے ان کی ہوشمندی اور معاملہ فہمی کا اعتراف کیا۔ یہ ایک فال نیک تھی۔ کہ بجائے اس کے کہ دونوں وفود میں کوئی اختلاف پیدا ہوتا۔ خود رشید پاشا نے اپنی معذوریوں پر نظر کر کے مصلحت وقت کو محسوس کیا۔ اور اپنی ضعیف العمری کا عذر کر کے گفت و شنید کے عام سلسلہ کو بکر سامی بے کے سپرد کر دیا۔ اور اس طرح حضرت مصطفےٰ کمال کے نمائندے کی قابلیت کا عملاً اعتراف کر لیا۔ بلکہ اپنی مصلحت اندیشی کا بھی ایک اچھا ثبوت دیا۔ بکر سامی بے نے بھی جس خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی پہلی تقریر میں رشید پاشا کی مراتب عالی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی ملت پرستی کی داد دی اور بلحاظ عمر و مرتبہ کے اپنے سے بزرگ شخصیت

کے ہوتے ہوئے دونوں وفود کی ترجمانی کا حق جس خوبی سے ادا کیا۔ وہ صاحب موصوف کی قابلیت کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ پھر دوران کانفرنس میں جس سنجیدگی اور پختگی کے ساتھ انہوں نے کام کیا۔ اس کا ایک عکس اخبارات کے کالموں میں دیکھ لیجئے۔ روز اوّل سب سے پہلے انہوں نے اپنے مطالبات کی بنیاد مضبوط کی یعنی صاف طور پر کہہ دیا۔ کہ حکومت انگورا عہدنامہ سیورے کی بنا پر کوئی گفتگو نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ اُس نے نہ اُس عہدنامہ کی ترتیب میں بحیثیت ایک فریق کے کوئی حصہ لیا نہ اس کی نظر میں اتحادیوں کی یہ خود ساختہ دستاویز کوئی وجود رکھتی ہے۔ (ترک ابھی تک اسی اصول پر جمے ہوئے ہیں) +

بکر سامی۔ بے نے کانفرنس میں پہلا قدم یوں اُٹھایا۔ اور اس طرح اپنے لئے گفت وشنید کی بہترین راہ نکالی۔ افسوس ہے۔ کہ ہم لوگوں کو ان سے باتیں کرنے کا کافی موقعہ نہیں ملا تاہم جو کچھ دیکھا۔ اور انکی زبان سے جو کچھ سُنا۔ وہ ہمارے قلوب کی تسکین کے لئے بالکل کافی ہے۔ اور ہم پورے اطمینان قلب کے ساتھ کہ سکتے ہیں۔ کہ حکومت انگورا صحیح راستے پر جا رہی ہے۔ اور الحمدللہ اس کے قدم استوار ہیں!

وفد انگورا کے دوسرے ممتاز رکن ڈاکٹر نہاد رشاد تھے۔ جو ایک نوجوان شخص ہیں۔ اور وہ پختگی نہیں رکھتے۔ جو گرم وسرد جھیلنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں کلام نہیں۔ کہ جماعت احرار میں انکی ذہانت اور قابلیت ایک خوشگوار چمک رکھتی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ ان میں ایک خفیف جھلک خود بینی کی بھی نظر آتے۔ لیکن ان کی موجودہ خدمات کے سوا دوسری چیزوں پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جامی بے (جن کا ذکر سفر اٹلی کے سلسلہ میں آئے گا)

بکر سامی بے کے ہم پلہ لوگوں میں ہیں۔ اور سب سے زیادہ ان کی متانت و سنجیدگی سے متاثر ہُوا ✦

ہم کو جستجو تھی۔ کہ غازی مصطفےٰ کمال اور ان کی حکومت کے صحیح حالات سنیں۔ اور یہ اندازہ کر سکیں۔ کہ اگر یونانیوں کا دست دراز ہوا۔ اور ان کی تلوار بے نیام ہوئی تو اناطولیہ کے مجاہدین اسلام کس حد تک ان کا مقابلہ کر سکیں گے۔ اس وقت تک یونانیوں کا حملہ شروع نہ ہُوا تھا۔ مگر مدبرین انگورا اچھی طرح جانتے تھے۔ کہ ایسا ہونا ہے۔ جس وقت یونانیوں نے (غالباً اپنے احباب کی رائے کے مطابق) سمرنا کے متعلق بین الاقوامی کمیشن کے فیصلہ پر حصر کرنے سے انکار کیا۔ اُسی وقت ترکوں نے سمجھ لیا تھا۔ کہ اب فیصلہ صرف تلوار ہی سے ہو سکے گا۔ اور وہ اُس آنے والے وقت کے لئے تیار تھے۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ میں اس باب میں تفصیلات پر گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن جنگ کے جو حالات اس وقت تک ہندوستان میں معلوم ہو سکے ہیں۔ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ترک غافل نہ تھے ✦

واقعات ابھی تک اس تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے ہیں۔ کہ میں قطعی طور پر پیشن گوئی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایک طرف صلح کی گفتگوئیں ہو رہی ہیں۔ اور ایک طرف جنگ کا سامان۔ معلوم نہیں۔ کہ ان اوراق کے شائع ہونے تک کیا صورتیں پیدا ہوں۔ مدبر حقیقی اپنے مصالح کو خود ہی جانتا ہے۔ آیندہ جو کچھ ہونے والا ہے۔ وہ اُسی کے علم میں ہے۔ غیروں اور دشمنوں کا شکوہ اور دوستوں کی تعریف۔ یہ سب فضول ہے۔ جو کچھ واقعات گزر چکے وہ ہر طرح اُمید افزا ہیں۔ جو آیندہ پیش آنے والے ہیں۔ ان کو خدا پر چھوڑ دیجئے یہی کام کیا کم ہے۔ (اگر مسلمانان ہند کے دل میں کافی درد ہو) کہ اپنی معذوری

(مجبوری کے عالم میں ہم مجاہدین اسلام کی جو کچھ مدد ہو سکے کرتے رہیں۔ اس کے بعد دعا اور امید اجابت! (الحمدللہ کہ دعائیں مقبول ہوئیں اور کارساز حقیقی نے ترکوں کو سرفراز فرمایا)۔

ایک ضیافت

۱۲ مارچ کو وزیر اعظم سے پہلی ملاقات ہوئی اور ۱۴ مارچ کو ہمارے وفد کی طرف سے ترکی دفود کو سوائے ہوٹل میں ایک پر تکلف ضیافت دی گئی جس میں ان وفود کے تقریباً تمام اراکین اور بہت سے ہندوستانی احباب مقیم لندن شریک تھے۔ نہ آسکے۔ تو صرف سید امیر علی ورنہ تقریباً تمام سرکاری وغیر سرکاری احباب (حتیٰ کہ صاحب زادہ آفتاب احمد خانصاحب بھی) موجود تھے۔ کھانے کی میز پر وسط میں سیٹھ چھوٹانی صاحب اور ان کے داہنی طرف بکر سامی بے اور بائیں جانب رشید پاشا تشریف رکھتے تھے۔ توفیق پاشا بوجہ علالت شریک نہ ہو سکے۔ سوائے ہوٹل کی خالص انگریزی آب و ہوا میں کم و بیش پچاس ہندوستانی اور ترکی اصحاب کا اجتماع ایک مخصوص کیفیت رکھتا تھا بعض غیر مسلم اصحاب بھی شریک تھے۔ ہندوستان کے مشہور خیر خواہ مسٹر بی۔ جی ہارنیمن۔ اڈیٹر بمبئے کرانیکل۔ گو بیچارے علیل تھے۔ مگر تشریف لائے تھے۔ ان کے علاوہ غیر مسلم اصحاب میں مسٹر لو بان جی۔ مسٹر آنک۔ مسٹر وکیل۔ مسٹر مارشل۔ مسٹر دوبے مسٹر سینٹ نہال سنگھ اور مسلمانوں میں مسٹر شعیب قریشی۔ مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی۔ مسٹر سید حسین۔ مسٹر اصفہانی۔ ڈاکٹر عبدالمجید۔ مسٹر عبدالقیوم ملک۔ مسٹر دوسے محمد علی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان وغیرہ بھی کھانے کی میز پر موجود تھے اجتماع خوب تھا۔ اور دلچسپ ہوتا اگر رسمی تواضع اور تصنع میں وقت ضائع نہ کیا

جاتا۔ اس قسم کی دعوتوں ضیافتوں اور محفلوں سے میری طبیعت ہمیشہ الجھا کرتی ہے۔ سازوسامان بہت ہوتا ہے۔ کھانے بھی مزے دار ہوتے ہیں۔ (اور مجھے ضرور پسند آتے ہیں۔ بشرطیکہ میٹھی چیزیں زیادہ ہوں۔ اور خوب میٹھی ہوں) اگر تقریریں ہوتی ہیں۔ تو وہ بھی بعض اوقات دلچسپ ہوتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس سب میں پابندی رسم ورواج کا ملمع اور تصنع کی کھوٹ بھی موجود ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کی صحبتیں اکثر بے نتیجہ ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً اس موقعہ پر ہم نے ترکی وفد کے ممبران کو خوب دیکھا۔ ان سے باتیں بھی کیں۔ مگر زیادہ تر محض رسمی۔ ایک فوٹو بھی بڑے اہتمام سے کھینچا گیا۔ دو تین گھنٹہ خاصی چہل پہل رہی۔ لیکن اس کے بعد کیا! اگر ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا جذبات اخوت و محبت کو ترقی دیتا ہے۔ (اور میں مانتا ہوں۔ کہ ایسا ہوتا ہے) تو اُس کے لئے بہترین صورت یہ ہے۔ کہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے بہت سے اجتماع ہوتے رہیں۔ ہر اجتماع میں دس پانچ آدمی ہوں۔ اور وہ بے تکلف بیٹھ کر کھائیں اور باتیں کریں۔ ورنہ یہ تو ایک رسم ہے۔ اور ایک "شان" ہے۔ کہ بڑی بڑی ضیافتوں کا اشتہار دیا جاتے! مختصر یہ کہ میں تو ہمیشہ اس قسم کے ہنگاموں سے بھاگتا ہوں۔ اور اگر وفد کا سکرٹری نہ ہوتا۔ تو اس موقعہ پر بھی بھاگ نکلتا۔ جیسا کہ بعض دوسری تقاریب میں جہاں مجھے موقعہ ملا۔ میں نے کیا۔ ہلکی ہوا میں دماغ و دل رضامند ہوتے ہیں۔ تیز جھونکے چلنے لگیں تو حواس پریشان ہوجاتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی طبیعت کی افتاد ہے۔ بہر حال سیٹھ چھوٹانی صاحب نے ایک رسمی تقریر فرمائی۔ اور اس میں ترک احباب کو بتایا۔ کہ مسئلہ خلافت اب ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اور اس مطالبہ حق و انصاف میں ہندوستان کی تمام اقوام

متحد ہیں۔ بعض دوسرے ہندوستانی اصحاب نے بھی تقریریں کیں۔ اور پھر بکر سامی بے نے فرانسیسی زبان میں رشید پاشا نے فارسی میں اور ڈاکٹر نہاد پرشاد نے کچھ فرنچ میں اور کچھ انگریزی میں اپنے وفود کی طرف سے جواب دیا۔ غرض دو تین گھنٹہ کی ہنگامہ آرائی کے بعد یہ تماشہ (جو لوگ ان محفلوں کے متعلق میری رائے سے متفق نہ ہوں۔ وہ معاف فرمائیں) ختم ہو گیا +

اس تماشہ کے بعد ہی ایک دوسرا سانگ کھیلا گیا جسمیں میں۔ ڈاکٹر انصاری مسٹر قدوائی اور سیٹھ چھوٹانی شریک نہ ہوسکے۔ ہندوستان کے نئے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کو لندن میں ایک رخصتی ضیافت ہندوستان کی ایک جماعت کی طرف سے دی گئی۔ جس کے صدر ہز ہائنس آغا خاں صاحب تھے۔ ہم لوگوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ لیکن ہم نے یہ عذر کیا۔ کہ ہمارا اس قسم کی تقریب میں شریک ہونا نان کواپریشن کے اصول کے خلاف ہے۔ اور اگر نہ بھی ہو تب بھی ہم کو اس طرح کی ضیافتوں میں شریک نہ ہونا چاہئے۔ درآنحالیکہ ہم برطانوی حکومت کے ان نمائندوں سے یکسر مایوس ہو چکے ہیں۔ جن کو ہندوستان کا حاکم بنایا جاتا ہے۔ آیندہ اگر لارڈ ریڈنگ کا طرز عمل اہل ہند کے لئے مفید ثابت ہُوا تو ہمیں انکی عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔ لیکن وقت سے پہلے ہم پیشگی قصیدہ خوانی کرنا نہیں چاہتے۔ اس موقعہ پر ہز ہائنس آغا خان کی تقریر اس میں شک نہیں۔ کہ نہایت زبردست تھی۔ اور چند روز اخبارات میں اس کا بہت چرچا رہا۔ مگر تقریریں اور یہ چرچے اب ہمارے درد کی دوا نہیں ہیں +

پھر ایک عہد انتظار!

۱۲ مارچ کی ملاقات کے بعد گو کہ وزیر ہند اور خود وزیر اعظم نے بھی وعدہ فرمایا تھا۔ کہ ابھی پھر گفتگو کا موقعہ دیا جائے گا۔ مگر دس بارہ دن گزر گئے اور اس وعدہ کے ایفا کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ دو تین دفعہ وزیر ہند سے عرض کیا گیا۔ کہ

اُس نے کیوں بخشی ہے اپنے در کی دربانی مجھے!

مگر وہ بھی کچھ نہ بتا سکے۔ کہ یہ عہد انتظار کب ختم ہوگا۔ یہ تو ہم خوب سمجھ چکے تھے۔ کہ برطانوی وزیر اعظم کی شخصیت کی ایک ادا یہ بھی ہے۔ کہ وہ نہایت بے نیاز ہیں۔ اور اپنے حلقہ اختیارات میں (جو بہت وسیع ہے) ایک خود مختار بادشاہ سے کم نہیں۔ ہم ہندوستان میں برطانوی حکام کی بیرخی اور بدمزاجی کو رویا کرتے ہیں۔ لیکن معلوم ہُوا۔ کہ انگلستان میں خود وزیر اعظم اس فن کے اُستاد کامل سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے روبرو وزیر ہند دفتر کے ہیڈ کلرک کی طرح دوڑتے ہیں۔ پہلی ملاقات میں ہم نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ذرا ذرا سے کام کے لئے مسٹر مانٹیگو کو اشارہ کرتے تھے۔ معلوم نہیں یہ ان کی فطرت ہے یا پندار۔ بہر حال جو کچھ ہو بیچارے مانٹیگو صاحب برطرف بھی اسی طرح کئے گئے۔ جیسے میں اپنے گاؤں کے کارندے کو جواب دیدوں! اس استعفے اور اُس برطرفی کا قصہ بھی بہت عبرت انگیز اور سبق آموز ہے! یہ موقعہ نہیں کہ میں کچھ تفصیل سے عرض کروں۔ یوں سمجھ لیجئے۔ کہ ایک شاطر جب اپنی بازی "کھولنے" کے لئے ضرورت سمجھتا ہے۔ جس مہرہ کو چاہتا ہے۔

کٹا دیتا ہے۔ مُہرہ کے محسوسات شاطر کے کھیل کی ضروریات پر کوئی اثر نہیں رکھ سکتے۔ ہم اتنا ہی سمجھ لیں۔ تو کافی ہے۔ کہ برطانیہ کا موجودہ (اور اب سیاسی دنیا میں متوفی) وزیر اعظم جب اپنے دست و بازو۔ فوری ضروریات پر قربان کر سکتا ہے۔ تو پھر ہندوستانی غلاموں کی وہ امیدیں۔ جن کا مقطع سید حسن امام صاحب کا وہ پیغام ہے۔ جو انہوں نے ہندوستان واپس آکر اپنی درماندہ قوم کو سُنایا تھا۔ ایک خوفناک سُراب ہے! ایک ہیولہ ہے۔ پانی کا ایک بلبلہ ہے۔ ایک فریب خیال ہے۔ اور بس۔

تو بہ دیگراں چہ کردی کہ بما کنی نظیری

بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن!

ہندوستانی وفد نے بھی وزیر اعظم کے شاہانہ مزاج کا کچھ مزا چکھا۔ یا تو پہلی ہی ملاقات میں الطاف و اکرام کی وہ بھرمار تھی۔ کہ تعریف و توصیف کے بارگراں نے مسٹر حسن امام کے کاندھے جُھکا دیئے۔ یا پھر یہ بے نمکی تھی۔ کہ دوسری ملاقات کے لئے وقت مقرر ہونا محال ہو گیا۔ ہم تو کیا۔ خود وزیر ہند بھی معذور رہتے۔ بہت سی یاد دہانیوں کے بعد ان کو کہنا پڑا۔ کہ وزیر اعظم سے ملنے کے لئے انتظار کی کٹھن گھڑیاں یوں ہی گزرا کرتی ہیں ہمنے خار جاً سُنا کہ بعض اوقات سلطنت کے بڑے بڑے لوگوں کو وزیر اعظم سے ملنے کے لئے بہت کچھ کوہ کندن کرنی ہوتی ہے۔ وقت بھی مقرر ہو جاتا ہے۔ مگر در دولت پر حاضر ہوتے ہیں تو لوٹا دیئے جاتے ہیں! وزیر اعظم کو فرصت نہیں!

ہندوستانی ریاستوں کے درباروں میں یہ رنگ بہت دیکھا ہے۔ برطانوی ہندوستان کی رعایا بھی جانتی ہے۔ کہ "صاحب" کی ملاقات کے لئے کتنی دیر دیر درخت کے نیچے بیٹھنا پڑتا ہے۔ گرمی کے موسم میں ۱۲ بجے دن تک انتظار

کرنے کے بعد جب صرف دو تین منٹ کی ملاقات نصیب ہوئی تو وہ بھی "دل فصل کا کیا حال ہے؟" "بارش کی ضرورت نہیں؟" وغیرہ کے بعد "دل اچھا سلام" کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں "صاحب" و سرکار کے یہ سب تماشے جزو زندگی ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ حاکمانہ بے نیازی کے یہی نمونے انگلستان کے گہوارہ حریت میں بھی نظر آئیں گے۔ اس عہد انتظار و التوا میں ایک دن تو ہمارے ساتھ بھی وہی معاملہ پیش آیا جو اکثر ریاستوں میں اہل غرض کو پیش آتا ہے۔ یعنی "سرکار" اور "حضور" سے ملاقات کی اُمیدیں صبح سے عمامہ باندھ کر اور چغہ پہن کر بیٹھ گئے۔ تو یوں ہی شام ہوگئی مگر چوبدار نہ آیا! ایک دن وزیر ہند نے ہم لوگوں کو بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی۔ کہ شاید آج وزیر اعظم وفد کو طلب فرمائیں۔ اس لئے کوئی گھر سے باہر نہ جائے اور ہر شخص تیار و منتظر رہے۔ چنانچہ ہم سب تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ اور پہلے سے باہر جانے کے جو اوقات مقرر کر لئے تھے۔ ان سب کو مسترد کر دیا۔ اب گھر میں حاضر ہیں۔ گوش بر آواز ہیں۔ ٹیلیفون کے پاس بیٹھے ہیں۔ شام کو جواب ملا۔ کہ آج نہیں! شاید کل! پھر بھی "شاید"! یہ "شاید" بے نیازوں کی بے نیازیوں کا ایک ہلکا سا عکس تھا۔ جو نیازمندوں سے خراج نیازمندی طلب کر رہا تھا۔ اور ہم تھے کہ ان ذلتوں کو فلسفیانہ انداز سے پی جاتے تھے!

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی ـ گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا!

صحبتیں اور مشورے

اس زمانہ میں جبکہ پہلی ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کے لئے دراز

کھٹکھٹاتے جا رہے تھے۔ اراکین وفد دوست احباب کی ملاقاتوں میں وقت گزار رہے تھے۔ بعض اصحاب جلد ہندوستان جانا چاہتے تھے۔ مگر یہ بھی گوارا نہ تھا۔ کہ وزیر اعظم کا آخری جواب حاصل کئے بغیر چلے جائیں۔ مسٹر حسن امام اپنے پیشہ کے کاموں کی وجہ سے پا بر کاب تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب ہندوستان کے دوسرے قومی کاموں کو چھوڑ کر انگلستان میں وقت ضایع کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ بہر حال مجبور و معذور سب منتظر بیٹھے تھے۔ لندن سے باہر جانا بھی ممکن نہ تھا۔ مبادا "چوبدار" آئے اور ہم موجود نہ ہوں۔ وہاں رہ کر دوست احباب کی صحبتوں میں وقت گزارنے یا ہندوستان کی جد و جہد کے متعلق انگلستان کے سیاسی حلقوں میں کچھ کام کرنے کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ ترکی وفد بھی لندن سے رخصت ہو چکے تھے۔

وزیر اعظم سے دوسری ملاقات ہنوز ایک وعدہ فردا تھا۔ اس عرصہ میں ایک ترک دوست طلعت بے نے جو لندن میں مقیم ہیں۔ ہم سب کو ایک شب کھانے پر مدعو کیا میری عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ میں نے کسی ترک کے گھر میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ترکی کھانوں کا مزہ بھی پہلی دفعہ چکھا۔ اور دو مہینہ تک بے نمک اُبلے ہوئے گوشت کے ٹکڑے اور کچی ترکاریوں کے کھانے کے بعد طلعت بے کا دسترخوان گویا آسمانی نعمتوں سے بھرا ہُوا پایا۔ ہر لقمہ پر ہندوستان یاد آیا۔ بلکہ بعض چیزیں تو ہندوستان کے کھانوں سے بھی لذیذتر تھیں۔ تین چار ننھے ننھے ترک ہماری گودوں میں بیٹھے تھے۔ گو زبان نہ جاننے کی وجہ سے ہم اپنی محبت کا پیام صرف نظر سے اور اشاروں سے ان تک پہنچا سکے۔ کس قدر خوب صورت تندرست اور چست و چالاک بچے تھے۔ میں اُن کی

صورتیں دیکھتا تھا۔ اور دل میں کہتا تھا۔ اے رب العالمین کیا مجاہدین اسلام کی یہ نسلیں اپنے آباو اجداد کی شاندار وراثت سے محروم کردی جائینگی۔ ان کے ہاتھ میں تلوار ہوگی یا کاسہ گدائی یا زنجیریں؟ ان کے خوبصورت چہرے اور مضبوط جسم دیکھ کر مجھے ہندوستان کے بسورتے ہوئے اور نیم جان بچے یاد آتے تھے۔ دل کہتا تھا۔ کہ ابھی ترکوں کی نسل میں دم باقی ہے۔ اگر عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا دم باقی نہیں۔ تو کم از کم سپاہیوں اور مجاہدوں کی طرح مرنے کا دم ضرور باقی ہے۔ انشاءاللہ +

۱۶ مارچ کی شب میں لندن کے ہندوستانیوں نے ترکی وفود کو ایک ضیافت دی۔ جس میں علاوہ بہت سے معزز اصحاب کے چند خواتین مسز اصفہانی۔ مسز حسن امام۔ مسز دوپے بھی شریک تھیں۔ مسٹر اصفہانی نے بحیثیت صدر کے ایک دلچسپ تقریر فرمائی۔ ان کے بعد مسٹر حسن امام نے ہندوستان اور خلافت کے متعلق ایک زبردست تقریر کرتے ہوئے صاف صاف کہا۔ کہ اگر خلافت کے متعلق اقوام ہندوستان کے متحدہ مطالبات پر توجہ نہ کی گئی۔ اور انگلستان نے اپنے وعدے پورے نہ کئے۔ تو وہ ہندوستان کو سلطنت برطانیہ سے جدا ہونے پر مجبور کردے گا۔ اگر مجوزہ ترمیمات کو ترک منظور بھی کرلیں تب بھی ہندوستان رضامند نہ ہوگا۔ اس تقریر کے متعلق لندن کے اخبارات اور خصوصاً "ٹائمز" نے مسٹر حسن امام پر سخت نکتہ چینی کی جس کا صاحب موصوف نے ایک تحریر کے ذریعہ سے جواب بھی دیا۔ مگر اس کو ٹائمز نے چھاپنے سے انکار کردیا۔ بکر سامی بے نے میزبانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یقین دلایا۔ کہ ترک مرنا اور تباہ ہوجانا قبول کریں گے۔ بجائے اس کے کہ کسی ذلیل کرنے والی صلح پر رضامند ہوں +

احباب کی صحبتوں کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ صبح سے شام تک آکسفورڈ و کیمبرج کے نوجوان طلبا آتے رہتے تھے۔ اخبارات کے نمایندوں کا حملہ کچھ کم تو ہو گیا تھا۔ مگر ختم نہ ہُوا تھا۔ خدا خدا کر کے اطلاع ملی۔ کہ ۲۴ تاریخ کی سہ پہر کو وزیر اعظم ستم کشان انتظار کو دوسری دفعہ شرف باریابی عطا فرمائیں گے ؞

دوسری ملاقات

اس دفعہ چونکہ دار العوام کا اجلاس ہو رہا تھا اس لئے وزیر ہند وہاں مصروف تھے۔ اور ہمارے ساتھ شریک نہ ہو سکے۔ ہز ہائینس آغا خان بھی لندن سے جا چکے تھے۔ البتہ دفتر ہند کے ایک دوسرے عہدہ دار ہم کو لے کر ایوان پارلیمنٹ میں گئے۔ جہاں وزیر اعظم کے کمرہ میں ملاقات قرار پائی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ میں نے لندن کے اُس گہوارۂ حقوق انسانیت (اس انسانیت میں کالے رنگ کی انسانیت شامل نہیں ہے) میں قدم رکھا جو دُنیا کے آئین جمہوری کی ماں کہی جاتی ہے۔ گو کہ جہاں تک ہندیوں کا تعلق ہے۔ اس ماں کے بطن سے ہمارے لئے ایک چوہے کا بچہ بھی پیدا نہ ہو سکا! وسیٹمنسٹر کی تاریخی عمارت میں پہلی دفعہ داخل ہو کر جس چیز نے سب سے پہلے اپنی طبیعت پر ایک غیر خوشگوار اثر ڈالا وہ اس عمارت کی تاریکی اور خاموشی تھی۔ دیواریں بلند ہیں۔ دریچوں میں خوبصورت شیشے لگے ہوئے ہیں۔ مگر جن ابتدائی کمروں سے ہم گزرے وہ کچھ عجب تاریک و غیر آباد ویران اور خاموش نظر آتے تھے۔ ہر طرف برطانوی مدبرین و مشاہیر کے مجسمے نصب تھے۔ یہ محسوس ہوتا تھا۔ کہ گویا ان مجسموں کی ارواح اس تاریکی میں سرایت کر گئی ہیں۔ اور اس طرح

آپس میں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ کہ انسانی زندگی کی حرکت بالکل بند ہے۔ کیا عجب ہے۔ کہ اس شہر خموشاں میں کسی دن گلیڈسٹن کے روح نے مسٹر لائڈ جارج اور لارڈ کرزن کے قدم چومے ہوں! حالانکہ پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مگر باہر کے کمروں میں ایک سناٹا تھا۔ میرے تخیل میں برطانوی دارالعوام کی تصویر ہی کچھ اور تھی۔ میں تو سمجھتا تھا۔ کہ ایک چہل پہل ہو گی۔ ممبران و عمائدین ملک اِدھر سے اُدھر پھر رہے ہوں گے۔ اہل عملہ بغل میں کاغذات لئے بھاگ رہے ہوں گے۔ اعلیٰ افسروں کی جگمگاتی وردیاں نظر آئیں گی۔ ایک گھما گھمی ہو گی۔ لیکن وہاں سوائے پولیس کے دو چار افسروں کے کوئی بھی نہ تھا۔ ہم کو وزیر اعظم کے کمرہ تک پہنچنے میں دو چار جگہ رُکنا پڑا۔ دارالعوام میں کوئی شخص بغیر اجازت کے داخل نہیں ہو سکتا۔ عوام کا ذکر کیا ہے۔ خاص خاص آدمیوں کو بھی پروانہ راہداری کی ضرورت ہے! چنانچہ پہلے دفتر ہند کے افسر کے ذریعہ سے جو ہمارے ساتھ تھے داخلہ کے ٹکٹ حاصل کئے گئے۔ پھر وہ ٹکٹ دو تین دروازوں پر پولیس کو دکھاتے گئے۔ تب کہیں بارگاہ وزارت تک گزر ہُوا۔ ایک تنگ برآمدے میں تین چار چھوٹے چھوٹے کمروں کے دروازے نظر آتے ہیں۔ جو غالباً مختلف وزرا کے کمرے ہیں۔ ایک دروازہ پر مسٹر ایسکوئیتھ کا نام بھی لکھا ہُوا تھا۔ آخری کمرہ سے ملا ہُوا ایک کمرہ وزیر اعظم کے پرائیویٹ سکرٹری کا ہے۔ پہلے وہاں حاضر ہوتے۔ اور چند منٹ بعد پرائیویٹ سکرٹری ہم کو وزیر اعظم کے کمرے میں لے گئے۔ کمرہ جمہور و صباح کے اڈیٹر کے کمرے سے بڑا نہ تھا۔ وزیر اعظم کی پشت پر آتشدان تھا۔ اور سامنے دفتر کی ایک معمولی میز تھی۔ مسٹر لائڈ جارج وہی تھے۔ جن کو پہلے دیکھا تھا۔ یعنی صورت شکل وہی تھی۔ مگر تیور دوسرے تھے۔ جیسے کسی کا جگر یا معدہ خراب ہو۔ یا شب

کو نیند نہ آنے یا بدخوابی کی وجہ سے صبح کو مزاج چڑچڑا ہو۔ یا صبح کے ناشتہ کے متعلق باورچی نے کوئی خطا کی ہو! غرض معمولی مراسم ادا ہوئے۔ اور ہم لوگ بٹھائے گئے۔ نشست کی صورت یہ تھی۔ کہ وزیر اعظم کی میز کے سامنے ایک چھوٹی سی میز اور تھی۔ اُس کے گرد ہم سب بیٹھ گئے۔ سید حسن امام صاحب نے گفتگو شروع کی۔ مگر آج اُن کا رنگ بھی پھیکا اور ہلکا تھا۔ جیسے کسی کے قدم رُکتے ہوں۔ اور راستہ صاف نظر نہ آتا ہو۔ بہت ممکن ہے۔ کہ وزیر اعظم کے تیور نے سید صاحب کے خیالات کو منتشر کر دیا ہو۔

بہرحال اس ملاقات میں گفتگو کا سلسلہ اُس تحریر کے حوالہ سے شروع ہُوا۔ جو وزیر اعظم کی خواہش کے مطابق تیار کر کے بھیجی گئی تھی۔ گو کہ مسٹر لائڈ جارج نے بھی فرمایا۔ کہ وہ اس تحریر کو "نہایت غور کے ساتھ" پڑھ چکے ہیں۔ لیکن صاحب موصوف کے طرز کلام سے یہ معلوم تھا۔ کہ ان کی گفتگو ہماری تحریر پر مبنی نہیں ہے۔ اور نہ بحث کی غرض یہ ہے۔ کہ کوئی سمجھوتا ہو بلکہ وزیر اعظم کے ذہن میں فیصلے موجود ہیں۔ اور اُن ہی کے مطابق دلایل تیار کر لئے گئے ہیں۔ اور وہ اب پیش کئے جا رہے ہیں۔ تاکہ ہماری رائے کو متاثر کیا جائے۔ ایک کاغذ صاحب موصوف کے سامنے تھا۔ جس کو وہ دیکھتے جاتے تھے۔ کیا تھا۔ معلوم نہیں۔ پرائیویٹ سکرٹری مسٹر فلپ کار (جن کی ہوشمندی کو دیکھ کر لوگ کہتے ہیں۔ کہ کسی زمانہ میں ان وزیر اعظم ہو جانا ناممکن نہیں!) ہر معاملہ میں وزیر اعظم کے دست راست ہیں۔ وہ پاس ہی موجود تھے۔ اور جب ایک دو دفعہ کوئی الجھن پیدا ہوئی۔ اور وزیر اعظم ذرا رُکے تو مسٹر کار نے فوراً اُٹھ کر ان کے کان میں کمک پہنچا دی!

مسٹر حسن امام نے پہلی ملاقات کی طرح اس دفعہ بھی دوران گفتگو میں با

بار اس حقیقت کو عرض کیا۔ اور سمجھایا۔ کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ یا وفد کی طرف سے جو خیالات ظاہر کئے جا رہے ہیں۔ وہ سب مسلمانان ہند اور ان کی ہموطن اقوام کے خیالات ہیں۔ ترکوں نے کیا کہا۔ اور کیا نہ کہا۔ اس سے ہم کو کوئی بحث نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے مطالبات کی نوعیت وہ ہے۔ جس کو ترک بھی ماننے پر مجبور ہیں۔ جہاں تک مذہبی احکام کا تعلق ہے۔ جو ہمارے اکثر مطالبات کی بنا ہیں۔ ترک بھی وہی مذہب رکھتے ہیں۔ جو ہمارا ہے۔ اتحادیوں کی ناانصافیوں پر ترک بھی اُسی طرح زور دے رہے ہیں۔ جس طرح ہم زور دے رہے ہیں۔ ترکوں اور اہل ہند کے مطالبات میں اختلاف کی کوئی صورت ہی نہیں۔ مگر وزیر اعظم پر جب کبھی ہمارا کوئی مطالبہ اُن پر گراں گزرتا فوراً یہ دلیل لاتے تھے۔ کہ ترکوں نے تو ایسا نہیں کہا۔ ترک تو یہ مطالبہ نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ تعجب ہے۔ کہ ہر تین منٹ کے بعد مسٹر لائڈ جارج بھول جاتے تھے۔ کہ ہمارے مطالبات ہندوستان کی عام رائے۔ برطانیہ کے وعدوں اور سب سے زیادہ شریعت اسلامی پر مبنی ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کہ ترکوں نے کیا کہا۔ ہمیں تو بحث اس سے ہے۔ کہ وزیر اعظم نے ہم سے کیا وعدے کئے تھے اور ہم نے کن وعدوں کی بنا پر ترکوں کے خلاف تلوار اُٹھائی تھی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کہ ترک ہمارے مطالبات کی تائید کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ ہم تو صرف یہ دیکھتے ہیں۔ کہ حق و انصاف بھی ہمارا موید ہے یا نہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کہ ترکوں سے اور اتحادی وزرا سے کیا گفتگو ہوئی ہندوستان اور برطانیہ کا معاملہ جُدا ہے! مسٹر حسن امام نے مختصراً اُن تمام مباحث کو دُہرایا جو یادداشت میں پیش کئے گئے تھے۔ جب انہوں نے خلیفۃ المسلمین کی بیادت کے متعلق کچھ کہنا شروع کیا۔ تو وزیر اعظم جو اب تک خاموش تھے۔ ذرا سنبھل

بیٹھے اور سوال کیا۔ کہ آپ عرب ریاستوں پر بھی سلطان کی سیادت چاہتے ہیں؟ مسٹر حسن امام نے جواب دیا۔ کہ ہم صرف مذہبی سیادت چاہتے ہیں نہایت معصومانہ انداز سے ارشاد ہُوا۔ کہ ہمیں اس مذہبی مسئلہ سے کیا تعلق! یہ تو مسلمانوں کا حق ہے۔ جس کو چاہیں خلیفہ مانیں۔ انگلستان نے تو کبھی اس خالص مذہبی معاملہ میں دخل نہیں دیا۔ مسٹر حسن امام نے وزیر اعظم کو بتایا۔ کہ مسلمانوں کو مجوزہ عہد نامہ کی دفعہ ۱۳۹۔ اس بارہ میں زیادہ متردد کرتی ہے۔ وزیر اعظم کے جواب سے صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہمارے مطلب کو اچھی طرح سمجھ گئے۔ فرمانے لگے۔ کہ کیا آپ اُن الفاظ کا حوالہ دے رہے ہیں۔ کہ سلطان کو غیر ممالک کے مسلمانوں پر کسی قسم کا حق باقی نہ رہے گا۔ مسٹر حسن امام نے کہا۔ کہ میرا مطلب یہی ہے۔ اب حسب معمول وزیر اعظم کی بحث نے فوراً ایک دوسرے پہلو کی طرف گریز کی اور فرمانے لگے۔ کہ کیا خلیفہ اسلام کی مذہبی سیادت اسی قسم کی ہے۔ جس قسم کی کہ عیسائی دنیا میں پاپائے روما کی سیادت ہے۔ سید حسن امام صاحب نے کہا کہ دونوں چیزیں مختلف ہیں۔ اسوقت یہ بحث کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ اور مسٹر لائڈ جارج اسی پر زور دیتے رہے۔ کہ خلیفہ کی حیثیت وہی ہے۔ جو پاپائے روما مسیحی دنیا میں رکھتا ہے۔ ان کا دماغ اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ اور مجھے اندیشہ ہے۔ کہ عہد جدید کے "روشن خیال" نوجوان ترک بھی اس کی صحیح اہمیت سمجھنے میں قصور کر رہے ہیں۔ قوم فروش وحیدالدین کے بعد (اپنے دوسرے سفر یورپ کے تجربات کی بنا پر کہتا ہوں) عبدالمجید آفندی خلیفہ کے اُس اصلی منصب سے فی الحال محروم ہیں۔ (شریعت اسلامی کے اس مفہوم کے مطابق جو ہم کو ہمارے علما نے سمجھایا ہے۔) جس کے اندر حکومت اور خلافت کے اختیارات جدا نہیں ہو سکتے۔ میں اس دوسرے سفر یورپ کے دوران میں جو ۱۲ جنوری ۱۹۲۳ء کو ختم

ہُوا ہے۔ لوزان بھی گیا تھا۔ جہاں صلح کانفرنس کے بہت سے ترک شرکا سے گفتگو کا موقعہ ملا۔ جنرل عصمت پاشا سے دو گھنٹہ تک صرف مسئلہ خلافت پر ایک طویل گفتگو ہوئی۔ میں ابھی اپنے اُن خیالات کو پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جو اس دوسرے سفر کا نتیجہ ہیں۔ لیکن رُکتے رُکتے اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ اس وقت ترکوں کے درمیان مختلف خیالات رکھنے والی جماعتیں موجود ہیں اور اس خاص مسئلہ کے متعلق جمعیتہ ملیہ انگورہ کے آزاد خیال لیڈروں کے اندر خلیفہ کے دینوی اور مذہبی منصب کی اہمیّت کا خیال بہت دھندلا اور کمزور ہے۔ غالباً اِس خیال سے غازی مصطفٰے کمال اور عصمت پاشا جیسے مقتدر حضرات اتفاق نہیں کرتے۔ نہ اناطولیہ کے عامتہ الناس اِس بحث میں پڑتے ہیں۔ مگر ان کے نوجوان لیڈر اسلامی قومیت کو یورپین نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ وہ بھی سمجھتے ہیں۔ کہ یورپ میں پاپائے روما کی حقیقت سوائے اس کے کچھ نہیں۔ کہ وہ کیتھولک مذہب کی محدود دنیا سے نذرانہ وصول کیا کرے۔ اور چند عہدے تقسیم کر دیا کرے۔ میں پہلے کسی مقام پر عرض کر چکا ہوں۔ کہ یورپ میں کوئی قومیت مذہب پر مبنی نہیں۔ اس لئے کیتھولک قومیت کا دردبست کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جو کیتھولک جس سلطنت میں رہتے ہیں۔ عموماً اسی سلطنت کی قومیت میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے مسلمان خواہ کسی ملک اور کسی سلطنت میں رہیں۔ تاہم بحیثیت مجموعی ساری دُنیا میں باوجود اختلافات تہذیب ونسل ورنگ وزبان ان کی قومیت ایک ہی ہے۔ اور اس قومیت کے شیرازہ کی باگ ازروے مذہب حقہ خلیفہ اسلام کے ہاتھ میں ہے۔ قصہ مختصر مسٹر لائڈ جارج سے ہماری اس بحث کا یہ حصہ مہمل ہو کر رہ گیا۔ وزیر اعظم نے بھی برطانوی تدبر کا وہی پُرانا نسخہ پیش کر دیا۔ کہ برطانیہ کبھی

کسی مذہبی معاملہ میں دخل نہیں دیتا۔ مسٹر حسن امام اپنی قانونی بحث پیش کرتے تھے۔ اور اُدھر سے بجائے اس کے کہ وزیر اعظم کسی دلیل و برہان سے متاثر ہوتے یا اُس کی تردید کرتے اُسی ایک سبق کو دہراتے رہے۔ کہ "ہم سے ترکوں نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا"۔ اور یہ کہ "ہم تو کبھی کسی کے ایسے معاملہ میں دخل نہیں دیتے"۔ بہت کرم فرمایا۔ تو یوں ارشاد ہُوا۔ کہ "میں اس معاملہ کو یادداشت میں لکھے لیتا ہوں۔ کہ جب ترکوں سے قطعی فیصلہ ہو تو میں اس معاملہ کو صاف کردوں"۔ اگر یہ کوئی وعدہ ہے۔ تو اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لئے مجھ سے بہتر دماغوں کی ضرورت ہے! میں تو کچھ نہ سمجھا۔ کہ یادداشت میں لکھ لینے اور ترکوں سے قطعی فیصلہ کرنے کے وقت اس معاملہ کو صاف کر دینے کا مطلب کیا ہُوا اسی سلسلہ گفتگو میں پھر ایک مرتبہ ارشاد ہُوا۔ کہ "ہمیں تو اس بات پر فخر ہے۔ کہ ہماری سلطنت میں کسی کے مذہبی عقاید سے تعرض نہیں کیا جاتا"۔ بالکل بجا فرمایا! مذہبی عقاید سے کبھی تعرض نہیں کیا جاتا۔ اور کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ کہ وہ اپنے کسی عقیدہ کو جو اس کے دل میں جاگزیں ہو دل سے نکال دے۔ مگر کیا ہندوستان میں مذہبی عقاید پر عمل کرنا بھی آسان ہے؟ خلافت کے متعلق ہمارے عقاید سے کوئی تعرض نہیں۔ لیکن اگر ہم اُن عقاید کی بنا پر ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کریں۔ یا اب کہ برطانیہ جنگ سے فارغ ہو چکا ہے۔ اور غیر جنبہ دار ہے۔ یونان کے خلاف ترکوں کو مدد دینا چاہیں تو ایسا کرنے کی عام اجازت مل سکتی ہے؟ پہلی ملاقات میں ہز ہائینس آغا خان جیسے "اعتدال پسند" نے عرض کیا تھا۔ کہ برطانیہ غیر جنبہ دار ہے تو غیر جنبہ دار رہے۔ مگر ہم کو اجازت عطا ہو کہ ہم یونان کے خلاف ترکوں کی اعانت کریں۔ میں گزشتہ صفحات میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ اس معروضہ کا جواب کیا ملا! لاریب کہ رعایا کے مذہبی عقا

سے ذرا تعرض نہیں کیا جاتا۔ لیکن اُن عقاید پر بہرحال عمل کرنے کی آزادی دینا یہ ایک دوسرا سوال ہے! اس سوال کا جواب ضرورت ہو تو مقدمہ کراچی کی روئیداد سے کافی وشافی دیا جا سکتا ہے۔ وہ سارا مقدمہ مذہبی عقاید کی بحث پر مشتمل ہے۔ اور ملزمین (خصوصاً مولانا محمد علی صاحب) نے تو اپنے بیانات میں اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ کہ مذہب اور عقاید کی آزادی اور عام مذہبی رواداری کا عملی مفہوم برطانوی ہندوستان میں کیا ہے۔ میرے لئے اس موقعہ پر ضرورت نہیں۔ کہ اس اہم ترین بحث کو چھیڑدوں ہندوستان کا ہر مسلمان مقدمہ کراچی کی روئیداد پڑھ چکا ہے ✦

غرض الفاظ کی یہ شطرنج خوب کھیلی گئی۔ جیسی کہ اکثر کھیلی جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے۔ کہ ہمارے ترجمان نے وزیر اعظم کی جادو بیانی سے باربار دھوکہ کھایا۔ بجائے اس کے کہ وہ مذہبی عقاید پر عمل کرنے کی آزادی کا سوال اٹھاتے اپنا راستہ بھول کر دوسری طرف جا نکلے۔ اور حقوق انسانیت کے بنیادی اصولوں پر ایک ضرب لگادی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سابق پریسیڈنٹ نے فرمایا۔ کہ "اگر آپ ہم کو اس امر کا یقین دلادیں (کہ آپکی پالیسی یہ ہے۔ کہ مذہبی عقاید سے تعرض نہ کیا جائے) اور اگر برطانوی سلطنت کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات ملحوظ رکھے گئے۔ اور ان کو تسکین قلب دی گئی۔ تو کیا وہ پھر بھی کسی دوسری گورنمنٹ کے تحت میں رہنا چاہیں گے؟ وہ کیوں ایسا چاہیں گے؟ وہ تو خود ایک ایسی حکومت کے تحت میں زندگی بسر کرنا پسند کریں گے۔ جو ان کے مذہبی محسوسات میں ان کو آزادی دیتی ہے" حیران ہوں۔ کہ سید صاحب کہاں سے کہاں پہنچ گئے! صاحب موصوف نے شاید یہ سمجھا ہو۔ کہ ان الفاظ کے ذریعہ سے وزیر اعظم کو وہ بہ اسلوب احسن یہ بتا رہے ہیں۔ کہ

اگر طمانیت نہ دی گئی۔ تو ہندوستان آپ کی حکومت میں رہنا پسند نہ کرے گا لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے اپنی عجلت میں ہندوستانی قوم پرستوں کے بنیادی اصولوں پر ٹھوکر ماردی۔ ہوم رول و سوراج کے سارے تخیل کو درہم و برہم کردیا وزیراعظم کو ذراسی ڈھکی ہوئی دھمکی دینے کے لئے (جبکی ضرورت نہ تھی اور تھی تو صاف الفاظ میں تھی) سید صاحب نے ہندوستان کی جدید قومیت کے سنگ بنیاد پر بے تکلف ایک ضرب لگائی۔ ایک پتّے کے حاصل کرنے کے لئے سارے درخت کی جڑ کو اکھیڑنے کی کوشش کرنا ایک ذوق غلط اندیش کی دلیل ہے۔ میں سید صاحب کی نیت پر حملہ نہیں کرسکتا۔ اور خواہ اختلاف رائے کچھ ہی ہو۔ مگر مجھے کبھی یقین نہ آئے گا۔ کہ سید حسن امام صاحب ہندوستان کے مطمح نظر سے۔ بلکہ تمام دنیا کی محکوم اقوام کے مشترکہ مطمح نظر سے۔ اسقدر بے پروا ہونگے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وزیراعظم کی کسی ادا نے انہیں متاثر کیا اور وہ نادانستہ ایک ٹھوکر کھا گئے۔ حالانکہ حقوق انسانیت کے اس بدیہی اصول کو ان کے مرتبہ اور قابلیت کا کوئی شخص نظرانداز نہیں کرسکتا۔ کہ آزادی وحکومت خوداختیاری اس لئے طلب کی جاتی ہے۔ کہ وہ انسانوں کے فطری حقوق میں اُس کا عزیز ترین حق ہے۔ اور یہ کہ ناانصافیوں اور جابرانہ حکومت کے متعلق اگر کوئی "طمانیت" حاصل ہوسکتی ہے تو وہ یہی صرف یہی ہے۔ کہ آیندہ حکومت کی باگیں اپنے ہاتھ میں ہوں۔ قومیں غیر قوموں کی حکومت کو کسی حال میں بھی پسند نہیں کرسکتیں۔ خواہ وہ غیر قومیں کتنی ہی عدل گستر اور انصاف پرور ہوں۔ دُنیا کی محکوم اقوام عدل گستری اور انصاف پروری کی طالب نہیں۔ وہ سب اپنے اوپر اپنی حکومت چاہتی ہیں۔ خواہ وہ کیسی ہی ہو۔ ہم نے کبھی نہیں کہا نہ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ اگر خلافت کے معاملہ میں انصاف کیا

جائے گا۔ تو ہم سوراج کے مطالبہ سے دست بردار ہو جائیں گے۔ آزادی کا مطالبہ تو صرف اس لئے ہے۔ کہ آزادی انسانیت کا فطری حق ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے۔ کہ (جیسا کہ کانگریس کا عقیدہ ہے) سلطنت برطانیہ میں دوسرے شرکا کے ساتھ ایک مساوی درجہ حاصل کر کے ہندوستان بھی اس سلطنت کے آزاد اجزا میں سے ایک جزو قرار پائے۔ اور ایک ہی جھنڈے کے نیچے اپنے وجود کو اس طرح قائم کرلے کہ آئندہ کالے اور گورے کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے اور مساوی حقوق کے ساتھ ہندوستانی قوم بھی برطانوی نوآبادیوں کے دوش بدوش کھڑی ہو سکے۔ اگر پنجاب کا معاملہ پیش نہ بھی آیا ہوتا۔ اگر خلافت کا مسئلہ پیش نظر نہ بھی ہوتا۔ تب بھی آج نہیں تو کل سوراج کا سوال یقیناً پیدا ہوتا۔ اس لئے کہ یہ اقتضائے فطرت انسانی ہے۔ اور دُنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم کو ہمیشہ محکوم نہیں رکھ سکتی۔ فطرت الٰہی خود اس مطالبہ حقوق انسانیت کی ضامن ہے۔ میں تو کہتا ہوں۔ کہ اگر بفرض محال کسی دن ہندوستان والے انگلستان پر یا کسی غیر ملک پر مسلط ہو جائیں اور وہاں اُسی طرح کی حکومت قائم کر دیں۔ جس طرح آج ہندوستان میں قائم ہے۔ تو وہ انسان کے فطری حقوق کو پامال کریں گے۔ جس طرح آج ہندوستان میں ہو رہے ہیں۔ قدرت کے جغرافی اور فطری تقسیم کے خلاف جو قوم بھی قدم بڑھائے گی غلطی کرے گی۔ سید حسن امام صاحب کے الفاظ نہ صرف قوم پرستوں کے مطالبہ آزادی سے متصادم ہوئے بلکہ وہ تو اعتدال پسند فریق کے مطمح نظر سے بھی ٹکرا گئے!

اس کے بعد بعض دوسرے مسائل پر جو ہماری یادداشت میں درج تھے۔ بحث ہوتی رہی۔ دوران گفتگو میں امیر فیصل کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ

پیش آیا۔ یہ حضرت جو عرصہ تک اپنی ایمان فروشی کا صلہ پانے کی امید میں اتحادیوں کے ممالک میں دریوزہ کرتے پھرتے تھے۔ اُس وقت لندن میں موجود تھے۔ اور ہندوستانی وفد کے پاس چونکہ آپ کا پیام آیا تھا۔ کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ اس لئے ایک دن سید حسن امام صاحب ڈاکٹر انصاری اور مسٹر قدوائی انکی خدمت میں گئے۔ اور انکی زبان سے ان کے خیالات سُن آئے۔ بر سبیل تذکرہ وزیر اعظم نے یہ ظاہر کیا۔ کہ خود امیر فیصل بھی عراق عرب میں برطانوی حکمبرداری (Mandate) کو پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ اراکین وفد سے امیر صاحب کچھ اور ہی فرما چکے تھے۔ جب سید حسن امام صاحب نے وزیر اعظم کو بتایا۔ کہ امیر فیصل برطانیہ کی حکمبرداری کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ اور خود اراکین وفد سے اپنا یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں۔ تو مسٹر لائڈ جارج بہت چراغ پا نظر آئے۔ بار بار حیران ہو کر سوال کرتے تھے۔ کہ کیا واقعی اُس نے تم سے ایسا کہا۔ ہم سے تو کبھی ایسا نہیں کہا۔ پھر ازراہ استہزا فرمانے لگے۔ کہ شاید امیر فیصل ہمارا (Mandate.) نہیں چاہتا۔ صرف ہمارا روپیہ لینا چاہتا ہے! اس واقعہ کے بعد امیر فیصل اور مسٹر لائڈ جارج کے درمیان کیا گزری ہمیں معلوم نہیں۔ بہرحال ہزار ذلتوں اور رسوائیوں کے بعد اب اِس دُنیا طلب کو اپنے گناہوں کی مزدوری مل گئی۔ اور وہ عراق کا بادشاہ بن گیا۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ گناہوں کی یہ کمائی کتنے عرصہ تک ساتھ دیگی!

عراق عرب کے متعلق جب وزیر اعظم پر زیادہ زور دیا گیا۔ کہ برطانوی فوجیں وہاں سے ہٹائی جائیں اور ان کو بتایا گیا۔ کہ فرانس ترکوں کے حقوق کو اچھی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ تو صاحب موصوف نے بہت ہی

چیں بجبیں ہو کر فرمایا۔ کہ اگر فرانس کو ترکوں سے اس قدر ہمدردی ہے۔ تو وہ شام سے کیوں واپس نہیں آتا؟ شیخ قدوائی صاحب نے جواب دیا۔ کہ اگر آپ عراق عرب سے واپس چلے آئیں گے۔ تو فرانس یقیناً شام کو خالی کر دے گا۔ اس جواب کو سُن کر وزیر اعظم نے گفتگو کا رُخ معاً دوسری طرف پھیر دیا!

جب قسطنطنیہ کے متعلق بحث شروع ہوئی تو مسٹر حسن امام نے وزیر اعظم کو بتایا۔ کہ نہ صرف سمندر کی طرف سے بلکہ خشکی کی طرف سے بھی قسطنطنیہ بالکل غیر محفوظ رہے گا۔ اس لئے کہ یونانی اگر خطوط چٹالجہ تک قابض رہیں گے تو وہ ہر وقت قسطنطنیہ پر حملہ کر سکیں گے۔ پس یہ کہنا۔ کہ قسطنطنیہ ترکوں کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا۔ محض طفل تسلی ہے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ سمندر اور خشکی دونوں جانب سے وہ دشمنوں کے حلقہ میں محصور ہے۔ اس کا جواب کسقدر معقول ملا یعنی یہ کہ خطوط چٹالجہ ہی پر ترکوں نے بلغاریہ کی فتح یاب فوج کو روکا تھا۔ خطوط چٹالجہ دُنیا کے سب سے زیادہ مضبوط استحکامات میں شمار کئے جاتے ہیں۔" حیران ہوں۔ کہ برطانوی وزیر اعظم کسقدر جلد جرمنوں کی اُن توپوں کو بھول گئے۔ جنہوں نے اینٹورپ۔ لینٹنر اور نمور کی ناقابل تسخیر استحکامات کو پاش پاش کر دیا تھا۔ جو ساحل فرانس سے ساحل انگلستان پر گولہ باری کر سکتی تھیں اور جنہوں نے پچاس میل کے فاصلے سے پیرس کو تباہ کر دیا تھا۔ حالانکہ خطوط چٹالجہ تو قسطنطنیہ سے بہت ہی قریب ہیں۔ اور اپنے دوستوں کی عنایت سے یونان کا اس قسم کی بڑی توپیں استعمال کرنا کچھ مشکل بھی نہیں!

مسٹر لائڈ جارج کی گفتگو لطائف و ظرائف سے بھی خالی نہ تھی۔ اور بعض وقت تو میں بہت ہی لطف اندوز ہوتا تھا۔ مثلاً نوجوان ترکوں کی غلطیوں

پر افسوس فرماتے ہوئے وزیر اعظم کو سلطان عبدالحمید خاں مرحوم یاد آئے اور ارشاد ہُوا۔ "کہ اگر عبدالحمید زندہ ہوتے تو ترکوں کی یہ گت نہ ہوتی"! اور اس کے بعد تمام وہ مجبوریاں جنگی وجہ سے ترکوں کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔ اور ترکوں کی وہ کم فہمی اور مخالفت کہ انہوں نے "بلاوجہ" اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ غرض ساری داستان بیان فرمادی۔ یہ صفحات برطانوی تدبر و سیاست پر مفصل تبصرہ کرنیکی غرض سے نہیں لکھے جارہے ہیں۔ ورنہ اس بحث کو میں بھی چھیڑتا کہ ترکوں نے کیوں اعلان جنگ کیا تھا۔ اور گذشتہ دس سال کی خفیہ سازشیں (اور روس کے ساتھ قسطنطنیہ کے متعلق خفیہ معاہدے) کہاں تک اس اعلان جنگ کا باعث ہوئی تھیں۔ اور یہ کہ درحقیقت اعلان جنگ کسکی طرف سے ہُوا تھا۔ (گو وہ باقاعدہ نہ ہو) بہر حال جب وزیر اعظم کو سلطان عبدالحمید یاد آئے تو مجھے بھی کسی شاعر کا ایک مصرعہ یاد آیا۔ کہ

جب دفن کر چکے تو خطا بھی معاف کی!

خطاوار کی روح کو اس عجیب انداز عفو پر بے اختیار ہنسی آئی ہوگی! عبدالحمید خاں مرحوم کی یاد نے انور بے وغیرہ کی "شرارتوں کی یاد بھی تازہ کردی۔ اور وزیر اعظم نے ان کی خطاؤں کی فہرست کھولنی شروع کی۔ حتیٰ کہ فرمانے لگے۔ کہ خود اُن ترکوں نے جو آتے ہوتے ہیں مجھ سے کہا۔ کہ ہم انور بے کے افعال کو قابل ملامت سمجھتے ہیں! میں اگر جواب دیتا تو یہ دیتا۔ کہ میں بھی اپنے بہت سے ممتاز ہمقوم اصحاب کے بعض افعال کو قابل اعتراض سمجھتا ہوں مگر دوسروں کو اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ وہ میرے ان اعتراضات کو میری ہی قوم کے خلاف استعمال کرنے لگیں۔ مگر ہمارے قابل وکیل نے ایک نہایت غیر ذمہ دارانہ بات کہی۔ انہوں نے فرمایا تو یہ فرمایا۔ کہ "میں بھی

نہیں کہہ سکتا۔ کہ انور پاشا نے اپنی نسل کو (اپنے افعال سے) کوئی فایدہ پہنچایا۔ جب ۱۴ء میں اعلان جنگ ہؤا تھا تو میں نے اُسی وقت محسوس کیا تھا۔ کہ یہ ایک غلطی ہے۔" سید حسن امام صاحب نے کیا محسوس کیا تھا۔ اعلان جنگ غلطی تھی یا نہ تھی انور پاشا نے ترکی قوم کو کتنا نقصان پہنچایا۔ ان کے گناہوں کی فہرست کتنی طویل ہے۔ اور اُن گناہوں کے متعلق سید صاحب کی معلومات کس قدر گہری اور وسیع ہیں۔ یہ سب سوالات زیر بحث آ سکتے ہیں۔ مگر برطانوی وزیر اعظم کے سامنے ہم اس لئے نہیں گئے تھے۔ کہ ترکوں کی خطا معاف کرائیں۔ اور ان کو بھیک کے چند ٹکڑے دلوائیں۔ ہم مسلمانان ہندوستان کے اُن مطالبات کو پیش کرنے گئے تھے۔ جو سراسر حق و انصاف پر مبنی ہیں۔ حسن امام صاحب کی ذاتی رائے کچھ ہو مگر ان کو کوئی حق حاصل نہ تھا۔ کہ وہ وفد کے متفقہ اصولوں کو تسلیم کرنے کے بعد ہمارے ترجمان بنکر اس ضابطہ کی ملاقات میں اپنے ذاتی خیالات پیش کرتے جن سے اکثر اراکین وفد کو قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ یہ غلطی ذاتی طور پر میرے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھی۔ اس لئے کہ میں یہ سمجھتا ہوں۔ کہ اُس زمانہ کے حالات جب ترکوں کو مجبوراً اعلان جنگ کرنا پڑا تھا۔ مجھے بھی زیادہ نہیں تو اتنے ضرور معلوم ہیں۔ جتنے سید حسن امام صاحب کے علم میں ہوں گے۔ اگر گنجائش ہوتی تو میں ان صفحات میں انصاف اور آزادی کے ساتھ ان کو بیان کرتا۔ کہ اسوقت جبکہ یورپین تدبر کی کشاکش میں ترکوں کے لئے دم مارنے کا موقعہ باقی نہ رہا تھا۔ انور بے کی غلطی تھی۔ تو یہ تھی۔ کہ انہوں نے ایک یورپین طاقت پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا۔ اور یہ نہ سمجھا۔ کہ جرمنی کو سوائے اپنی اغراض کو مد نظر رکھنے کے کسی چیز کی پروا نہیں اور آخر ہے تو وہ بھی ایک یورپین سلطنت۔ انور پاشا کی

بڑی غلطی یہی تھی۔ کہ انہوں نے جرمنوں کو اپنے ملک کے تمام نظم و نسق پر کیسر حاوی ہو جانے دیا۔ اور اسی کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ ترکی فوجیں جرمن افواج کی امداد کے لئے دور دراز ممالک میں بھیج دی گئیں۔ اور اپنا ملک خصوصاً عراق عرب وغیرہ خالی رہ گیا۔ بہر حال یہ بحث ایسی نہ تھی۔ جس پر مسٹر حسن امام کو ہمارے ترجمان کی حیثیت سے اپنی ذاتی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہوتا +

فلسطین کے متعلق وزیر اعظم کا مایوس کن اور خشک جواب اُن لوگوں کے لئے ذرا بھی تعجب انگیز نہ تھا۔ جو جانتے تھے۔ کہ مہینوں پہلے وزیر اعظم یہودیوں کے ممتاز اصحاب سے کیا سمجھوتہ کر چکے تھے۔ فلسطین کا نام آتے ہی وزیر اعظم نے نہایت روکھا سوکھا مُنہ بنا کر کہدیا کہ یہ مسئلہ تو طے ہو چکا۔ اس کے متعلق اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ گویا فلسطین کے معاملہ میں آبادی و کثرت و قلت یا کمزور وطاقت ور کے حقوق یا حق انتخاب حکومت اور اس قسم کی تمام جدید اصطلاحیں سب بے کار ہیں۔ تازہ ترین سرکاری اعداد مظہر ہیں۔ کہ فلسطین کی آبادی کُل ۷ لاکھ ہے۔ جس میں صرف $\frac{1}{10}$ یہودی ہیں۔ اُس $\frac{1}{10}$ کی خاطر سارے وہ اصول بھی جن پر دوسرے ممالک کے متعلق بہت زور دیا جاتا ہے۔ درہم برہم کر دیئے گئے۔ اس لئے کہ وزیر اعظم پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ کہ فلسطین یہودیوں کا حصہ ہے +

گفتگو کی یہ ناقابل اطمینان صورت قایم تھی۔ کہ دفعتاً دار العوام سے اطلاع آئی۔ کہ وہاں وزیر اعظم کی ضرورت ہے۔ اور وہ معاً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے انہوں نے سید حسن امام صاحب کی تھوڑی سی توصیف فرمائی اور ساتھ ہی وفد کے اراکین پر احسان کا ایک پشتارہ لاد دیا۔ یعنی فرمایا۔ "اکثر حیثیتوں میں محض ہندوستان کی مسلمان رعایا کی اس مداخلت کے باعث ترمیم کی گئی

ہے۔ جو انہوں نے اس قابلانہ وکالت کے ساتھ کی جسکو میں نے ابھی ابھی سُنا ہے۔" اس کے بعد ازراہ عنایت ہر شخص سے ہاتھ ملایا۔ اور مسٹر حسن امام سے دریافت کیا کہ وہ کب ہندوستان جا رہے ہیں۔ جسکا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ وکالت ختم ہوگی۔ اور اب آپ کی ضرورت نہ ہوگی۔ تمام اراکین وفد کے لئے یہ اشارہ کافی تھا۔ یعنی وکالت و معروضات کے دروازے بند ہوگئے!!

میں نہیں جانتا۔ کہ دوسرے اراکین وفد کے محسوسات کیا تھے۔ مگر میری نظر میں تو اس ۶ ہزار میل کے دوا دوش کا نتیجہ ایک بڑا سا صفر تھا! سید حسن امام صاحب دو تین دن کے بعد ہی ہندوستان روانہ ہوگئے۔ ہم نے چاہا تھا کہ روانگی سے پہلے وہ اِن ملاقاتوں کے نتائج پر اپنے خیالات شائع کردیں۔ لیکن انکی مصلحتوں نے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ اور انہوں نے فرمایا کہ انکی رائے میں ہندوستان پہنچ کر خیالات کا شائع کرنا مناسب ہوگا۔ تاہم وزیر ہند کو جو آخری خط وفد کی جانب سے لکھا گیا۔ اُس پر سید صاحب نے بھی دستخط فرمائے تھے۔ اور اس خط میں جس کا مسودہ میرے پاس محفوظ ہے۔ تمام اراکین وفد کی جانب سے ان ملاقاتوں کے نتائج پر مایوسی ظاہر کی گئی تھی یہ اُمید بیجا نہ تھی۔ کہ جو خیالات اس خط میں لکھے گئے ہیں۔ وہی سید صاحب ہندوستان جاکر ظاہر فرمائیں گے۔ اس وقت یہ خیال نہ تھا۔ کہ ہندوستان کی آب و ہوا میں اکسیجن اور ہائیڈروجن وغیرہ کے علاوہ ایک اور عنصر بھی شامل ہوتا ہے یعنی مصلحت وقت۔ جب میں اور ڈاکٹر انصاری صاحب ہندوستان واپس آرہے تھے۔ تو عدن پر کچھ ہندوستانی اخبارات ملے۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ سید صاحب نے نہ صرف بمبئی کے جلسہ میں تقریر کرنے سے احتراز فرمایا۔ بلکہ اخبارات کے نمائندوں کو بھی اپنے خیالات بغرض اشاعت

نہ دیتے۔ البتہ ایسوشی ایٹڈ پریس کے نمائندے سے فرمایا تو یہ فرمایا۔ کہ "مجھے معلوم ہُوا ہے۔ کہ اخبارات میں یہ خبر شایع ہوئی ہے۔ کہ میں نے بمبئی میں یہ کہا۔ کہ برطانوی وزیر اعظم کے مزاج اور طرز عمل سے اس امر کی کوئی اُمید معلوم نہیں ہوتی۔ کہ مسلمانوں کے تمام مطالبات پورے کئے جائیں گے۔ میں نے کوئی ایسی بات نہیں۔ اس لئے کہ وزیر اعظم سے جو گفتگو ہوئی۔ اس میں وزیر اعظم کی جانب سے کسی ایسی کیفیت کا اظہار نہیں ہُوا۔ وزیر اعظم نے مسلمانوں کی عرضداشت کو ہمدردی کی نظر سے دیکھا۔ اور اگر وہ ہندوستانی مسلمانوں کی اُمید کو پورا نہ کر سکے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ کہ وہ ایسا کرنا نہ چاہتے تھے۔ بلکہ وجہ یہ ہو سکتی ہے۔ کہ وہ مجبور تھے۔ بمبئی میں مجھ سے خواہش کی گئی تھی۔ کہ میں ایک عام جلسہ میں تقریر کروں۔ مگر میں نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ اس لئے کہ میں ابھی تک یہ سمجھتا ہوں۔ کہ وزیر اعظم کے حضور میں مسلمانوں کی عرضداشت ہنوز حیطۂ گفت وشنید سے باہر نہیں"۔

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو!

میں نے بار بار اس تحریر کو پڑھا اور اپنا سر دھنا۔ بمشکل یقین آیا۔ کہ ہمارے ترجمان کے سینہ میں ہنوز اُمیدوں کا خزانہ موجود ہے۔ کاشکہ ہمارے دلوں میں بھی وزیر اعظم کی ہمدردیوں کے اسقدر خوبصورت نقوش موجود ہوتے!

یہ تار ۲۶۔ اپریل کو شایع ہُوا ہے۔ اور دوسری ملاقات کے بعد ۲۶۔ مارچ کو وہ خط بھیجا گیا ہے۔ جس میں اراکین وفد (بشمول سید صاحب) کی جانب سے "انتہائی مایوسی" کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور ترتیب وار تمام مطالبات کے متعلق وزیر اعظم کے مایوس کن جوابات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ خط کے لہجہ سے صاف مترشح ہوتا ہے۔ کہ چونکہ گفت وشنید کے دروازے بند ہو گئے۔ اس لئے

اراکین وفد انگلستان میں اپنا مزید قیام فضول سمجھتے ہیں۔ ۲۶ مارچ کو سید صاحب نے اس تحریر پر دستخط فرمائے اور تیس دن کے بعد ۲۹۔ اپریل کو یہ بیان شائع فرمایا۔ کہ ہنوز بہت کچھ اُمید باقی ہے۔ اور وزیر اعظم کی ہمدردیوں کے دروازے کھُلے ہوئے ہیں!

میں مانتا ہوں۔ کہ سید صاحب کی قانونی قابلیت اس پایہ کی ہے۔ کہ وہ اپنے دونوں متضاد بیانوں کو بالکل صحیح اور یکساں ثابت کرسکیں گے۔ لیکن ایک ناواقف شخص کے دل پر سوائے اس کے کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کہ سید صاحب وزیر اعظم کے طرزِ عمل کے متعلق جو کچھ فرماتے ہیں۔ اگر وہ صحیح ہے۔ اگر معاملہ ہنوز "حیطۂ گفت وشنید سے باہر نہیں" تو پھر اراکین وفد کو لندن میں ٹھہرنا چاہئے تھا۔ اور اس گفتگو کو ختم کرکے واپس آنا چاہئے تھا۔ خود سید حسن امام صاحب کو بھی اپنے پیشہ کے مفاد کی قربانی گوارا کرنی چاہئے تھی۔ خصوصاً جبکہ وزیر ہند سرکاری طور پر ان کے مقدمات کو ملتوی کر دینے کا وعدہ کرتے تھے۔ لیکن اگر سید صاحب کا بیان صحیح ہے۔ تو ہم لوگ گفت وشنید کے دروازوں کو کھُلا چھوڑ کر واپس آ گئے۔ اس حالت میں یقیناً وفد پر قوم کی طرف سے عدم احساس فرض کا الزام لگایا جا سکتا ہے!

سید حسن امام صاحب وزیر اعظم کی ہمدردیوں کے شمیم عنبر بار ہندوستان میں جسقدر چاہیں پھیلائیں۔ مگر ملاقاتوں کی سرکاری روئیدادیں موجود ہیں۔ وفد کی تحریریں موجود ہیں۔ دونوں میں کہیں دو فقرے ایسے دکھا دیجئے۔ جس سے یہ ترشح ہوتا ہو کہ وزیر اعظم اپنے فیصلوں پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ یا وفد کو مزید گفتگو کا موقعہ دیں گے۔ حقیقت میں اب وہ وقت نہیں ہے۔ کہ محض امیدوں پر بھروسہ کیا جائے۔ سید صاحب کا دل اُمیدوں سے مخمور ہے۔ مگر انکی قوم

کا دل اس روشنی سے محروم ہو گیا ہے۔ اراکین وفد کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے محسوسات کو صفائی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کر دیں اور جو کچھ گزری ہے اُس کو صاف و صریح طور پر بیان کر دیں۔ ہم موجودہ کشمکش میں جو زندگی اور موت کی کشمکش ہے۔ اپنے دلوں کو پادر ہوا امیدوں سے متاثر نہ ہونے دیں گے خوشگوار توہمات کتنے ہی خوشگوار ہوں۔ مگر حقیقت نفس الامر کو نہیں بدل سکتے اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ حاصل ہوگا۔ اس وقت حاصل ہوگا۔ جب ہم زندگی کی کشمکش میں اپنا وزن ثابت کر دیں اور اپنی حیثیت قائم کر لیں۔

کیوں بلائے گئے تھے؟

ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔ بارگاہ وزارت کے دروازے بند ہو گئے۔ بندگان فرماں حاضر ہوئے اور رخصت کر دیئے گئے۔ ایک تماشہ تھا۔ کہ ختم ہو گیا۔ کوئی نئی بات ہمارے ذہن میں نہ تھی۔ جو کہتے۔ کوئی نئی بات وزیراعظم کے پاس نہ تھی جو وہ کہتے۔ ہم نے وہی کہا۔ جو عرصہ سے کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے وہی جواب دیا جو وہ دیا کرتے ہیں۔ ہمارے مطالبات بھی وہی تھے۔ انکا انکار بھی وہی تھا۔ ہماری عرض و معروض کا انداز کچھ بدلا ہوا نہ تھا۔ ان کی نفی کا وزن بھی پہلے سے کچھ کم نہ تھا۔ ہمارے آنے سے پہلے کچھ باقی نہ تھا جو وزیراعظم کے کان تک نہ پہنچا ہو۔ اور ملاقاتیں ختم ہو جانے کے بعد بھی کچھ باقی نہ رہا۔ جو آیندہ کہا جائے! غلام بھی وہی تھے۔ آقا بھی وہی تھا۔ ہماری پیشانی بھی وہی تھی۔ اور ان کا سنگ آستاں بھی وہی تھا۔ ہماری التجائیں بھی وہی تھیں اور ان کا اغماز بھی وہی تھا! پھر آخر یہ سب تھا کیا؟ ۶ ہزار میل

کا سفر وہ بھی اس طرح کہ تین دن کے اندر بستر باندھ لیا گیا۔ پھر ۱۲ ہزار میل واپسی
مہینہ بھر کا قیام۔ وزیر ہند و وزیر اعظم سے ملاقاتیں۔ یہ سب ایک خواب ہے کہ
چند روز یاد رہے گا۔ میں اس خواب کو حوالہ قلم کرتا ہوں۔ کہ اگر کہیں یہ صفحات
ہندوستان کے آئندہ مورخ کے ہاتھ پڑ جائیں۔ تو وہ بھی دیکھے۔ کہ ہندوستان
کس طلسم میں مبتلا تھا! ہر شخص پوچھتا ہے۔ کہ آخر گئے کیوں تھے؟ جواب اس
کے سوا کیا ہو۔ کہ "اس لئے کہ بلائے گئے تھے"۔ "اتنی جلد کیوں واپس آئے؟" اس لئے
کہ واپس بھیج دیئے گئے"۔ "کیا پایا؟" شاعر نے کیا خوب لکھا ہے ؎

"کہیں کیا اس کے گھر تک کیوں گئے کیوں جا کے پھر آئے۔
وہاں کی ٹھوکریں کھانا بدی تھیں کھا کے پھر آئے"

چشم عبرت نے کچھ دیکھا تو اس تماشے کی سطح کے نیچے برطانوی تدبر کی
ایک تصویر کہنہ دیکھی۔ بظاہر وزیر اعظم کی یہ بھی ایک ادا تھی کہ بیٹھے بیٹھے کچھ
خیال آیا۔ اور حکم ہوا۔ کہ بلا لو۔ بلائے گئے۔ اس معمہ کو جس صورت سے
چاہے دیکھئے!

داستان کا یہ حصہ ختم ہوتا ہے۔ دوسری ملاقات کے بعد صرف چار اشخاص
لندن میں رہ گئے۔ سیٹھ صاحب۔ ڈاکٹر انصاری صاحب۔ شیخ مشیر حسین
قدوائی صاحب۔ اور میں۔ سیٹھ صاحب علاج کی غرض سے یورپ جانا چاہتے
تھے۔ اور لندن کے ڈاکٹروں کی ہدایات کے مطابق انہوں نے آسٹریا میں ایک
مقام پر (کارلسباد) قدرتی چشموں سے علاج کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ شیخ قدوائی
صاحب برسوں سے اپنا زیادہ وقت لندن میں گزارتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی
فی الحال وہیں مقیم رہے۔ میں نے اور ڈاکٹر انصاری صاحب نے یہ طے کر لیا

کہ ہم کو جلد سے جلد روانہ ہو جانا چاہیئے۔ ۲۴ مارچ کو وزیر اعظم سے دوسری اور آخری ملاقات ہوئی۔ ۲۶ کو انڈین ایسوسی ایشن نے جو ہندوستانیوں کی ایک انجمن ہے۔ وفد کو چاء کی دعوت دی جس میں وفد کی جانب سے سیٹھ چھوٹانی۔ ڈاکٹر انصاری اور شیخ قدوائی صاحب نے مختصر تقریریں کیں۔ اس عرصہ میں بہت سے ہندوستانی احباب اور اکسفورڈ کیمبرج کے طلباء اصرار کر رہے تھے۔ کہ ڈاکٹر انصاری نان کواپریشن کے متعلق ایک مفصل تقریر فرمائیں۔ اور جو لوگ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تحریکوں کے متعلق اُن سے کچھ سوالات کرنا چاہیں ان کو سوالات کرنے کا بھی موقعہ دیا جائے۔ چنانچہ ۵۔ اپریل کو ماٹیمر ہال میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مفصل تقریر فرمائی جس کے بعد حاضرین میں سے بعض اصحاب نے نان کواپریشن کے متعلق مختلف سوالات کئے۔

جس دلچسپی اور شوق کے ساتھ سوالات کئے جاتے تھے۔ ان سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہندوستان کی نئی نسلیں جو انگلستان میں پرورش پا رہی ہیں اپنے وطن کی سیاسی جدوجہد سے بیخبر نہیں ہیں۔ بلکہ انکے جذبات بھی ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ بعض طلباء نے تو ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا۔ کہ نان کواپریشن کے تحت میں انگلستان کے کالجوں کو بھی کیوں نہ بائیکاٹ کیا جائے؟ چونکہ کانگریس کمیٹی نے اس امر کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ اس لئے ان پُرجوش بھائیوں سے یہی کہا گیا۔ کہ جب تک کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو اس باب میں رائے دینی مشکل ہے۔ مگر غالباً مہاتما گاندھی ذاتی طور پر اس کو پسند کرتے ہیں۔ کہ جو طلبا اس وقت انگلستان میں ہیں وہ وہاں سے وطن واپس آکر ملکی جدوجہد میں حصہ لیں۔ اس کے بعد ہندوستانی دوست احباب نے ضیافتوں کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا جسکا ختم کرنا مشکل ہوگیا۔

برائٹن

میں نے لندن کے سوا انگلستان کا کوئی حصہ نہ دیکھا تھا۔ علاوہ بریں وفد کے گوناگون مشاغل نے مجھے بالکل تھکا دیا تھا۔ اس لئے یہ خیال ہُوا۔ کہ روانگی سے پہلے انگلستان کی کوئی دوسری جگہ بھی دیکھ لیں۔ برائیٹن قریب تھا۔ لب سمندر بھی تھا اور برطانوی زندگی کے بہت سے نمونے وہاں دیکھے جاسکتے تھے۔ اس لئے مسٹر شعیب قریشی کے ساتھ میں دو تین دن کے لئے وہاں گیا۔ ساری آبادی دُور تک سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی ہے حتیٰ کہ بازار اور تھیئٹر وغیرہ بھی سب لب سمندر ہیں۔ بلکہ سمندر کے اُوپر ہیں یعنی ساحل سے دُور تک پانی کے اُوپر بہت وسیع پُل بنائے گئے ہیں۔ اور ان پر سیکڑوں دُکانیں اور بہت سے تھیئٹر ہیں۔ شب کو بجلی کی روشنی ان مقامات کو بہت حسین بنا دیتی ہے۔ سمندر کی موجوں کے پہلو میں دو ہی قسم کے انسان نظر آئے۔ یا تو نہایت بوڑھے مرد اور نہایت بوسیدہ عورتیں۔ جو سمندر کی صحت بخش اب و ہوا سے اپنی عمر کے گلے ہوئے اور کمزور تار کو کھینچ کھینچ کر بڑھانیکی کوشش کرتے ہیں۔ یا نوجوان مرد اور نوجوان عورتیں کہ ابتدائے عمر کے نشہ میں سرشار ہیں۔ اور سمندر کی موجوں میں جوانی کا ایک نغمہ سنتے ہیں۔ جو آنے والے بڑھاپے کے خطرات سے بالکل بیخبر کر دیتا ہے!
بڑھاپے میں زندہ رہنے کی خواہش بہت قوی ہو جاتی ہے۔ ہزاروں معذور وا پاہج دیکھے جو صبح سے شام تک سمندر کے کنارے اپنی اس خواہش کا اشتہار دیتے ہیں۔ نوجوان مرد اور لڑکیاں ان کو دیکھ دیکھ کر ہنستی ہیں۔ اور نہیں

جانتیں کہ یہ دن ان کے لئے بھی آنا ہے۔ برائیٹن کی آبادی میں غالباً کثرت اُن لوگوں کی ہے جو ذکور واناث کے تعلقات کی بے اختیاری وبے تکلفی کے لئے برائیٹن کی خاموشی دخلوت کو زیادہ مناسب سمجھتے ہیں! اور اقدام رندانہ کے لئے مناسب مواقعہ بھی کافی پاتے ہیں۔ اس قسم کی کسی پچاس برس تک کی عورت کو نہ دیکھا جسکی آرائشگی اسکی دوشیزگی کا دعوےٰ نہ کرتی ہو۔ اچھے اچھے ہوٹلوں میں جہاں "شرفا" کے سوا کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ شام کے کھانے پر اس قسم کی تجلیاں اُن تجلیوں کے ہنگامے اور آب سُرخ کی بدمستیاں دو لقمے کھانا مشکل کر دیتی ہیں!

شام کو برائیٹن کی "چوپاٹی" پر اس عشوہ فروشی کے بازار میں ایک چیز نہایت عبرت آموز نظر آتی تھی۔ اس انبوہ میں سیکڑوں انسانوں کو دیکھتا تھا۔ جو زخم خوردہ اور اپاہج بیماروں کی کرسیوں پر ادھر سے اُدھر ٹھیلے جاتے تھے! کسی کا ہاتھ کٹا ہُوا کوئی پا بریدہ۔ کسی کی آنکھیں پھوٹی ہوئی چہرہ بگڑا ہُوا۔ ناک کٹی ہوئی۔ کان غائب۔ غرض برائیٹن کے حسن دلاویز کو اُن لوگوں سے وہی نسبت تھی جو طاؤس کے خوب صورت پروں کو اُس کے پاؤں سے ہوتی ہے۔ یہ سب گذشتہ جنگ کے زخمی اور اپاہج تھے۔ یہ زندہ نمونے تھے یورپین تہذیب کے اُن کرشموں کے جنہوں نے سرزمین فرانس وبلجیم پر اتنا خون بہایا کہ آج تک خشک نہیں ہُوا ہے۔ اور ان مقامات پر جہاں کہیں ذرا سی زمین کھودی جاتی ہے۔ جما ہُوا خون آج تک ملتا ہے! جس طرح سمندر برائیٹن کے سنگریزوں سے کھیلتا ہے۔ قدرت انسانوں سے کھیلتی ہے۔ اپنے مشاغل تعیش میں وہ ہزاروں نوجوان جنگ کے خوفناک زمانہ کی ان زندہ یادگاروں کو ایک نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتے۔ اور اپنے عیش میں مست ہیں!

برائٹین سے واپس آکر مجھے خیال تھا۔ کہ دن بھر کے لئے اکسفورڈ کو بھی دیکھ آوں گا۔ مگر سفر کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں اور انگلستان سے جی اکتا گیا تھا۔ روانگی کی تیاریوں کے سوا کوئی بات بھلی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خدا خدا کرکے ۹۔ اپریل کو صبح کے ۱۱ بجے لندن سے رخصت ہوئے۔ اسٹیشن پر احباب کی جمعیت نے خدا حافظ کہا۔ ہماری ٹرین لندن سے جس قدر دُور ہوتی گئی۔ میری روح پر جو پتھر سا رکھا ہُوا تھا۔ اس کا وزن بھی ہلکا ہوتا گیا۔

عروس البلاد

انگلستان آتے ہوئے ہم نے انگلش چینل میں موسم اچھا پایا تھا۔ حالاں کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے۔ کہ ساحل فرانس سے ساحل انگلستان تک آنے میں سمندر کے تلاطم سے دوچار ہونا نہ پڑے گو یہ سفر ایک دو گھنٹہ سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن اسٹیمر چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں سمندر ہمیشہ کم و بیش متلاطم رہتا ہے۔ اسٹیمر بہت زیادہ جھکولے کھاتا ہے۔ اور مسافروں کی طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے۔ گو میں کسی سمندر کے سفر میں جہاز کی حرکت اور پانی کے تلاطم سے بدمزہ نہیں ہوتا۔ نہ کبھی متلی ہوتی ہے۔ نہ قے آتی ہے۔ مگر واپسی کے وقت انگلستان کے ساحل سے فرانس کے ساحل تک پہنچنا دوبھر ہوگیا۔ سمندر کی موجیں اسٹیمر کے بالائی عرشہ تک آتی تھیں اور اسٹیمر کا یہ حال تھا۔ کہ بُری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا حلق سے اُتارنا مشکل ہوگیا۔ رکابیاں میز پر ٹھہرنے سے قطعاً انکار کرتی تھیں۔ اور میں نے تو سمندر کا ایک طمانچہ ایسا کھایا۔ کہ عمر بھر یاد رہے گا۔ ہم اپنے چھوٹے بیگ اور کمبل

وغیرہ اُوپر عرشہ پر چھوڑ آئے تھے۔ میں کھانا کھانے کے بعد اس خیال سے اُوپر گیا۔ کہ اپنا چھوٹا بیگ اُٹھالاؤں اور ذرا سمندر کے تلاطم کا لطف بھی دیکھوں مگر عرشہ پر پہلا ہی قدم رکھا تھا۔ کہ ایک موج زور سے آکر ٹکرائی میں وہیں گرگیا اور اگر دو چار قدم اور آگے بڑھا ہوتا تو تعجب نہ تھا کہ وہ موج مجھے کھینچ کر سمندر میں لے جاتی۔ اس صورت میں دنیا کی آبادی تو کچھ کم نہ ہوتی مگر یہ اوراق شروع سے آخر تک سادہ رہ جاتے! بہرحال جہاز کے ملازمین نے سنبھالا سارے کپڑے شرابور ہوگئے اور اُس چڑیا کی طرح جس کو کنوئیں سے نکالا گیا ہو ہم نیچے آکر آتشدان کے پاس سوکھنے لگے! وے بخیر گزشت جہاز کے اندر ہر طرف لوگوں کا یہ بُرا حال تھا۔ کہ اس کو دیکھ کر طبیعت بدمزہ ہوتی ہے۔ ہر طرف لوگ اُگالدانوں میں مُنہ ڈالے پڑے ہوئے تھے۔ اور کھانے کا کمرہ بُری بُری آوازوں سے گونج رہا تھا۔ تاہم میں نے دوپہر کا کھانا پیٹ بھر کر کھایا! اگالدانوں والے دیکھ دیکھ کر رشک کرتے ہوں گے۔ شام کو بجے پیرس کے اسٹیشن پر پہنچے جہاں اپنے دوست موسیو والدام کو موجود پایا۔ سیدھے ہوٹل گئے۔ اور ترک احباب کو اپنے وہاں پہنچنے کی اطلاعیں دیں +

ہم نے اپنے پروگرام میں ایک ہفتہ پیرس کے لئے رکھا تھا۔ ڈاکٹر نہاد رشاد۔ خلیل خالد بے۔ ڈاکٹر بہجت بے اور بعض دوسرے احباب سے مفصل ملاقاتیں ہوئیں۔ خلیل خالد بے تو اسی ہوٹل میں تھے جس میں ہم مقیم تھے۔ اس لئے دن میں کئی کئی دفعہ ملاقات ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نہاد رشاد دوسرے تیسرے دن ملتے رہے۔ ڈاکٹر بہجت بے تقریباً روزانہ تشریف لاتے تھے۔ رہے موسیو والدام وہ تو اس طرح ہمارے ساتھ تھے۔ کہ گویا ہم ان ہی کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پیرس میں جو کچھ قومی کام کیا۔ اور جو کچھ سیر

کی وہ سب موسیو والدام کی بدولت۔ ان جیسے سچے کام کرنے والے سو میں ہیں نصیب ہوں تو ہندوستان کی کوششوں کو چار چاند لگ جائیں۔ سچے۔ سادہ۔ بے لوث۔ محبت کرنے والے۔ بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ بیچارے اپنے تمام کاموں کو چھوڑ کر ہر وقت ہمارے ساتھ تھے۔ اور ہم بھی انکی محبت سے کافی ناجائز فایدہ اُٹھاتے تھے۔ ڈاکٹر بہجت وہی ڈاکٹر انصاری صاحب کے پرانے دوستوں میں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑے ہی دلفریب آدمی ہیں۔ دو دن ڈاکٹر صاحب کو بخار آیا تو ان بیچارے کی یہ حالت تھی۔ کہ رات کو ایک ایک بجے تک ڈاکٹر صاحب کے بستر کے قریب بیٹھے رہے۔ اور مجھے تو انہوں نے تیمارداری کا موقعہ ہی نہ دیا۔

ترکوں کی جدوجہد کے متعلق بہت سی معلومات ہم نے ان احباب سے حاصل کی۔ اور ان کو ہندوستان کے اصلی حالات بتائیے۔ وہ سب ہی ہمارے اس خیال کو بہت پسند کرتے تھے۔ کہ پیرس میں ہندوستان کی جدوجہد کے متعلق تبلیغ و اشاعت کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے جو تمام اسلامی مسائل کو مد نظر رکھ کر فرانس میں کام کرے۔ میرا تو اب بھی یہ خیال ہے۔ کہ انگلستان سے زیادہ پیرس و روما میں خلافت کمیٹی کے نمائندوں کا موجود رہنا ضروری ہے۔ دوسرے سفر یورپ نے اس خیال کو زیادہ قوی کر دیا ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ میں خوب دیکھ کر آرہا ہوں۔ کہ ابتک خلافت کمیٹی نے پیرس میں جو روپیہ تبلیغ و اشاعت میں خرچ کیا۔ وہ تقریباً ضایع گیا مجھے اس باب میں بڑی شکایت مہاتما جی سے ہے۔ جنہوں نے ہمیشہ غیر ملکوں میں تبلیغ کے کام کو روکا اور کبھی پسند نہ کیا۔ اُن جیسا عالی دماغ شخص اس حقیقت سے تو بیخبر نہ ہوگا۔ کہ اب ہندوستان دور دراز سمندر کا کوئی غیر آباد جزیرہ نہیں ہے۔

جس کے انسان ہنوز عہد وسطےٰ کی تاریکی میں جانوروں کی کھالوں اور درختوں کے پتوں سے ستر پوشی کرتے ہوں۔ بہرحال ان صفحات میں اس بحث کا لانا ضرور نہیں۔ ورنہ اس باب میں میرے ناچیز خیال بہت وسعت چاہتے ہیں۔
پیرس میں ایک ہفتہ اس طرح گزرا۔ کہ گزرتا ہُوا معلوم بھی نہ ہُوا۔ لندن کے بعد یہ ۳۰ لاکھ کی آبادی اور اُسی کی نسبت سے شہر کی عمارتیں اور بازاروں کی چہل پہل ہمارے لئے کوئی بڑی عجیب بات نہ تھی۔ تاہم برطانوی دارالسلطنت کی تاریکی اور سردی سے نکل کر پیرس کی آب وہوا بیحد خوشگوار معلوم ہوتی۔ یا لندن کی سربفلک عمارتیں ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی ابھی شاہراہ پر چلنے والوں کو چاروں طرف سے گھیر کر کچل دیں گی یا پیرس کے خوب صورت بازار اور محلے ہیں۔ کہ وہ اتنے کشادہ نہ بھی ہوں۔ مگر صاف اور ستھرے ہیں۔ اس "جنت نگاہ" میں ہر قدم پر برطانوی اور فرانسیسی قوموں کا فرق صاف نظر آتا تھا۔ نہ صرف عمارتیں اور شہر کی دلچسپیاں۔ بلکہ فرانسیسی اخلاق بھی ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ مجھے تو یہ محسوس ہُوا۔ کہ اگر یورپ میں کوئی قوم ہے۔ جو بلحاظ فطری مذاق کے ایشیا سے کچھ ربط رکھ سکتی ہے۔ تو وہ فرانسیسی قوم ہے۔ تصنع نہیں ہے۔ معائب ومحاسن دونوں صاف نظر آتے ہیں۔ عیبوں پر اس غرض سے ملمع نہیں کیا جاتا۔ کہ وہ ہنر معلوم ہوں۔ سچائی اور خوش اخلاقی بے لاگ ہے۔ اور اسی طرح گناہ بھی عریاں ہے ا ہر عیب وصواب سب بے پردہ ہے۔ بُرا کہئے یا اچھا۔ شاید یورپ کی تمام دوسری اقوام اس خصوصیت سے محروم ہیں۔ شام کو بلوارد پر چہل قدمی کیجئے۔ یا تولیریز کا نظارہ دیکھئے۔ یا شب کو کسی اوپرا میں یا فالیز میں جائیے۔ وہی بے تکلفی اور رسم وراہ کی آزادی نظر آئیگی۔ جو معصیت سے تو پاک نہیں۔ مگر مکر سے پاک ہے! مومارٹ

(جو بجائے خود ایک محلہ ہے) میں تھوڑا وقت گزاریئے تو انسانیت کے عجیب عجیب نمونے نظر آئیں۔ یہ مقام رسم ورواج کی آزادیوں کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ایک ایشیا نژاد جب سورج کی روشنی میں مردوں اور عورتوں کی بے تکلفیوں کو سرِ راہ دیکھتا ہے۔ تو ایک سرسری نظر کے بعد اس کا دل اس سے پوچھتا ہے۔ کہ اگر بداخلاقیاں اور عیش پرستیاں قوموں کی تباہی کا بڑا سبب ہوتی ہیں۔ تو پھر یورپ کیوں زندہ ہے؟ معلوم نہیں ہمارے ہندوستان کے علمائے کرام (جو مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک عورت کو تقریر کرتے دیکھ کر بہت بے لطف ہوگئے تھے!) اُن مناظر کو دیکھ کر کیا کہیں؟ پیرس میں دو ہی قسم کے لوگ زندہ رہ سکتے ہیں یا تو وہ جو ان چیزوں کے عیب و صواب پر غور کرنے کی حدود سے آگے نکل گئے ہوں۔ یا وہ جو فلسفیانہ نظر سے ان تماشوں کو دیکھ سکیں! تھیٹروں اور ناچ گھروں میں جانے کی زحمت کیوں گوارا کیجے۔ شب کو سرِ راہ رقص کی محفلیں جمی ہوتی ہیں۔ ایک دو نہیں سارے شہر میں سینکڑوں۔ ان میں رقاصہ کا ہلکا ریشم کا لباس بھی اس کے جسم صندلیں سے بغاوت کرتا ہے۔ اور پھر گویا ملک کا کوئی قانون نہیں جو حوّا کی ان بیٹیوں پر عاید ہوسکے!

لباس کا ہر تکمہ سوئی کے ٹانکوں سے جھگڑا کرتا ہے۔ موزوں کی باریکی اور جسم کی رنگت میں تمیز کرنا ممکن نہیں۔ لباس کی تیاری میں اگر کفایت شعاری یوں ہی بڑھتی رہی تو عجب نہیں۔ کہ یورپ کی صنفِ نازک پھر ایک دفعہ فطرت کے اس لباس سے آراستہ نظر آئے "جس کا نہیں سیدھا الٹا"۔

آج تک ہندوستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ترکوں کی بداخلاقی کو ان کی تباہی کا باعث بتاتے ہیں۔ شاید سچ ہو۔ مگر کسی فرانسیسی کے سامنے

ایسا نہ کہئے گا! مفلس ہندوستانیوں کے طبایع کیونکر ان گرم بازاریوں سے مانوس ہوسکیں۔ میرا تو یہ حال تھا۔ کہ تخیل دو چیزوں میں اُلجھا ہُوا تھا۔ دن میں شہر کے اکثر مقامات دیکھتا تھا۔ جہاں گزشتہ جنگ کے خوفناک نقش و نگار ابھی تک موجود ہیں۔ گولوں کے گرنے کے نشان ٹوٹی ہوئی عمارتیں گری ہوئی دیواریں۔ میرا رہنما ہر چیز کو ٹھہر ٹھہر کر دکھاتا تھا۔ یہ کب ہُوا کیسے ہُوا۔ جب جرمنوں کا گولہ گرا تو اس محلہ کا کیا حال تھا؟ کتنے آدمی مارے گئے تھے۔ کتنے زخمی ہوئے تھے۔ غرض ساری تفصیل بتاتا تھا۔ مگر شام کو بازاروں میں اور لب سڑک رقص و سرود کے ہنگامے کچھ ایسے ہوتے تھے۔ کہ گویا اس شہر پر کبھی کوئی مصیبت ہی نہ آئی تھی۔ ہر شخص کا ایک قدم (کم از کم) بالکل بہشت کی چوکھٹ پر۔ اور دوسرا قدم دُنیا میں! یہ عالم میرے لئے ایک معمہ تھا! انسان کس قدر جلد مصیبتوں کو بھولتا ہے۔ اور ہمارے ایشیا میں جس چیز کو عبرت کہتے ہیں۔ وہ کیا ہے۔ کچھ ہے یا محض ڈھکوسلہ ہے! اس ہنگامۂ عیش میں سارا پیرس اور فرانس کی شہری آبادی غرق ہے!

گو کہ فرانسیسی قوم کا شمار جنگجو اقوام میں نہیں ہے۔ تاہم قومی شجاعت کے نشانات ہم کو ہر جگہ نظر آئے۔ نپولین کا نام تو پیرس کے در و دیوار پر موجود ہے۔ کہیں کوئی کتبہ لگا ہُوا ہے۔ کہیں نپولین کے نام کا فوارہ نصب ہے۔ کہیں بڑے بڑے مینار اور دروازے بنائے گئے ہیں۔ جن پر نپولین کی فتوحات کے مختلف مرقعے نقش ہیں۔ خود نپولین کا بنایا ہُوا مینار واندوم کالم اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ نپولین نے ۱۲سو توپوں کو جو وہ دشمن سے چھین کر لایا تھا۔ گلایا اور اس کے لوہے سے یہ ۱۴۲ فٹ اونچا مینار بنایا گیا۔ جس کے اوپر خود نپولین کا ایک مجسمہ نصب ہے۔ ایک

فوارہ "فاؤنٹین دی لا وکٹور" بھی فرانسیسی صناعی اور اس سے زیادہ فرانسیسی تخیل کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس کو نپولین اوّل نے اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر بنایا تھا۔ فوارہ کی وضع یہ ہے۔ کہ چار مجسموں پر فوارہ کا طشت رکھا ہُوا ہے۔ ہر مجسمہ حکومت کی ایک خاص صفت کا مظہر ہے۔ ایک وفاداری کی تصویر ہے۔ دوسرا "باخبری" کا مرقع ہے۔ تیسرا انصاف کا بُت ہے۔ چوتھا طاقت کا دیوتا ہے۔ ان سب سے اوپر "فتح" کا ایک انسانی تخیل مجسمہ کی صورت میں نصب ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد اب اگر تہذیب جدید کی یادگار قائم کرنی ہو تو اس فوارہ کو پانچ مجسمونکی ضرورت نہیں۔ صرف دو کافی ہیں۔ نیچے طاقت کا دیوتا اور اوپر فتح کا ایک پیالہ۔ جس سے خون کا فوارہ چل رہا ہو!

ایک دوسرا مینار پلاس دی لا کونکارد میں دیکھا جو عہد انقلاب کی یادگار ہے۔ یعنی جس جگہ وہ مینار بنایا گیا ہے۔ وہاں انقلاب کے زمانہ میں گردن کاٹنے کی مشین لگی ہوئی تھی جس پر انقلاب پسندوں نے سب سے پہلے خود اپنے بادشاہ کی گردن رکھی تھی! آج فرانس کے حالات دیکھ کر یقین نہیں آتا۔ کہ یہی وہ قوم ہے۔ جس نے آزادی کے لئے خون کے دریا بہائے تھے۔ اور اپنی قوم کے بڑے بڑے لوگوں کو کتّوں کی طرح مارا تھا۔ یا یہی وہ قوم ہے جو کل فلاندرس کے میدان میں اپنی ایک جوان نسل کو کلیتاً نابود کر چکی ہے۔ یہ جو عورتیں سڑکوں پر ناچتی ہیں۔ یہ وہی ہیں۔ جو کل فرانسیسی سپاہیوں کے زخم دھو رہی تھیں؟ یہ جو مرد شراب کی صراحیاں ہاتھوں میں لئے ہوئے مستانہ وار جھوم رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو کمر کس کر میدان جنگ میں گئے تھے۔ اور فرانس کے تمام اتحادیوں سے زیادہ خون بہا کر آئے تھے؟ کیسی عجیب جنگجوئی ہے۔ میدان جنگ کے سورما پیرس کی گلیوں میں ادائے

ناز کے مقتول ہیں! فطرت انسانی کے اس معمہ کو کوئی سمجھا ہو تو مجھے سمجھا دے جب میں نپولین کے مقبرہ میں کھڑا ہوا اسکی عالمگیر عظمت کی داستانیں دل میں دُہرا رہا تھا۔ تو بار بار میرا تخیل اس معمہ سے دست و گریبان ہوتا تھا۔ کہ جس قوم کے آغوش میں نپولین جیسا سپاہی۔ والٹیر اور روسو جیسے فلسفی اور حکما اور ہیوگو اور زولا جیسے اہل قلم پرورش پائیں۔ اس کے مشاغل زندگی میں جزو غالب تعیش کی بے اختیاریاں اور رنگینیاں ہوں +

پیرس کے نواح میں وارسای (Versailles.) ایک مشہور مقام ہے جسکی گزشتہ تاریخ نے مجھے بھی دعوت نظارہ دی۔ پیرس سے وہاں تک موٹر میں گیا۔ بلحاظ قدرتی خوب صورتی شادابی اور سبزہ کے میں نے سویزرلینڈ کے سوا اور کہیں اس قدر خوب صورت سڑک نہیں دیکھی۔ میلوں تک یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک سرسبز باغ ہے۔ جو پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ وارسای کی تاریخی عظمت کا سب سے بڑا سبب (میری نظر میں) یہ ہے۔ کہ اُسی کے رقبہ میں سب سے پہلے انقلاب فرانس کا شعلہ بلند ہوا تھا۔ اور وہ تلواریں سب سے پہلے وہیں بے نیام ہوئی تھیں جنہوں نے استبداد کے زہریلے درخت کو سرزمین فرانس سے کاٹ کر پھینک دیا۔ اس وقت سب سے زیادہ قابل دید شاہی محل سمجھا جاتا ہے۔ جس کو انقلاب کے بعد کوئی ایسا مکین میسر نہ آیا۔ جس کے سر پر تاج ہوتا۔ اور اب تو سوائے ایک دو بوڑھے دربانوں کے جو آنے جانے والوں کو عمارت کی سیر کرا دیتے ہیں۔ اور اس بہانہ سے انکی روٹیاں چلتی ہیں۔ اُس شاہی محل کے در و دیوار خاموش ہیں۔ جسکی تعمیر و آرایش میں ۱۵ کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔ ایک قبرستان ہے جسکی ایک ایک اینٹ میں فرانسیسی تاجداروں کی بلند اقبالی دفن ہے!

محل کے اکثر کمرے اسی حالت میں رکھے گئے ہیں۔ جو حالت کہ شاہ لوئی چہاردہم کے زمانے میں تھی۔ اس عہد کا مورخ کہتا ہے کہ وارسائی کا محل حسن و رعنائی کا ایک نگار خانہ تھا۔ اور آج بھی بہت سے ایسے نقوش وہاں نظر آتے ہیں۔ تصویریں۔ قالین۔ Tapestary اور بہت سی ایسی چیزیں اپنے گزرے ہوئے مالکوں کی قدر دانی کی یادگار موجود ہیں۔ عمارت کے ایک حصہ میں تقریباً تمام شاہان فرانس کی تصاویر آویزاں ہیں۔ لوہے اور پتھر کے مجسموں سے سارا پائیں باغ پُر ہے۔ دس دس قدم پر فرانسیسی مجسمہ سازی کی صنعت کے بہترین نمونے نصب ہیں۔ یونان و روما کے تمام دیوتاؤں کے مجسمے صناعوں کے تخیل کے بہترین نمونے۔ بلا مبالغہ تعداد میں اتنے ہی ہیں۔ جتنے کہ اُس باغ میں درخت ہیں! مگر وہ سب مصور کی صنعت اور انسانی حسن کا ایک ویران خانہ ہے۔ جس کے در و دیوار نے شاہان فرانس کی عیش پرستیوں کے کیسے کیسے ہنگامے دیکھے ہوں گے۔ ہم ہندوستان میں ایک جانعالم واجد علی شاہ اور محمد شاہ پیا کی بزم آرائیوں پر انگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ وہاں کتنے ہی جانعالم اور پیا گزر گئے ہیں۔ اور آج ہر شخص بجائے خود "جانعالم" اور "پیا" ہے۔ شاید فرانس کی سیاسی آزادیوں کا یہ بھی ایک اقتضا تھا۔ کہ جب بادشاہوں کی استبدادیت کا قلع قمع کیا گیا۔ تو ان کے حقوق شاہانہ جس میں تعیش بھی شامل ہے۔ اُن سے چھین کر عامۃ الناس کے اندر بدرجہ مساوی تقسیم کر دئے گئے۔ تاکہ اس جمہوریت میں ہر شخص بادشاہ ہو۔

جب ۱۸۷۰ء میں جرمنی اور فرانس کی لڑائی ہوئی تھی۔ اور جرمن فوج نے پیرس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ تو اسی محل میں جرمن شاہزادے اور افسر مقیم تھے۔ یہ واقعہ بھی عبرت آموز ہے۔ کہ تیس برس پہلے جس محل میں

جرمن افسروں نے فاتح کی حیثیت سے قیام کیا تھا۔ اسی محل میں گزشتہ جنگ یورپ کے بعد ۱۹۱۹ء میں جرمنوں نے مغلوب و پسپا ہو کر صلحنامہ پر دستخط کئے! وہ میز بھی دیکھی جس پر یہ صلحنامہ رکھا گیا تھا۔ اور وہ قلم بھی موجود ہیں۔ جس سے دول کے نمائندوں نے دستخط کئے تھے! وہی ایک محل ہے۔ جس میں فاتح بھی آئے اور مفتوح بھی۔ جو کل غالب تھا۔ آج مغلوب ہو کر آیا۔ اور معلوم نہیں کل پھر کیا ہونا ہے! اینٹ اور پتھر کی یہ دیواریں کیا کیا تماشے دیکھتی ہیں!

وارسائی کی سیر بحیثیت مجموعی بہت دلچسپ تھی۔ چند گھنٹہ ٹھہر کر میں پیرس چلا آیا۔ اس عرصے میں ترک احباب کے علاوہ بعض فرانسیسی اصحاب سے بھی سیاسی معاملات پر گفتگو ہوتی رہی جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ہم نے اہل فرانس کو اور فرانس کے سیاسی حلقوں کے ممتاز اصحاب کو بھی ترکوں کا ہمدرد پایا۔ لیکن وہ سب مجبور ہیں۔ کوئی عملی امداد نہیں دے سکتے۔ برطانیہ کے اتحاد نے ان کو بے دست و پا کر دیا ہے اور اس اتحاد سے زیادہ جرمنوں کا خوف جو اہل فرانس کے دل میں جاگزیں ہے۔ باوجودیکہ جرمنی کو شکست ہو چکی۔ فرانس نے جی بھر کر گزشتہ جنگ کا انتقام بھی لے لیا۔ اور لے رہا ہے۔ لیکن بچوں کی طرح جو خوف جی میں بیٹھ گیا ہے۔ وہ موجود ہے۔ وہ سمجھتے ہیں (اور یہ شاید ایک حد تک غلط نہ ہو) کہ دس برس کے بعد جرمنی کی طاقت پھر وہی ہو گی جو تھی اور پھر وہ فرانس پر حملہ کرے گا۔ پس وہ کہتے ہیں۔ کہ اگر ہم برطانیہ سے بگاڑ لیں تو ہمارے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں! برطانیہ بھی ان کے اس خوف سے کافی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اور جب فرانس کے تیور بدلتے دیکھتا ہے۔ فوراً جرمنوں کے ساتھ آشتی کا اظہار شروع

کر دیتا ہے!! اس موقعہ پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اہل فرانس کے دلوں میں جرمنوں سے کس قدر نفرت اور ان کا کس درجہ خوف جاگزیں ہے۔ میں روما سے نیس جا رہا تھا۔ میرے درجہ میں ایک فرانسیسی عورت اور اسکی پنج سالہ لڑکی بھی تھی۔ راستہ میں کسی اسٹیشن پر ایک بوڑھا مرد اور ایک بوڑھی عورت بھی آ کر بیٹھے۔ وہ فرانسیسی لڑکی میرے اور اس بوڑھے کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اسکی ماں اس کے سامنے کی نشست پر تھی۔ تھوڑی دیر تو وہ دونوں آنے والے خاموش رہے۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں گفتگو شروع کی۔ تو جرمن زبان میں مَیں اس وقت سمجھا۔ کہ وہ دونوں جرمن ہیں۔ اور غالباً یہی خیال اُس فرانسیسی خاتون کو پیدا ہُوا۔ وہ حرکت دیکھنے کے قابل تھی۔ کہ جیسے ہی فرانسیسی خاتون کو یہ محسوس ہُوا۔ کہ وہ دونوں جرمن ہیں۔ اُس نے فوراً اُٹھ کر اپنی لڑکی کو وہاں سے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ جس طرح مرغی خطرہ کو محسوس کر کے اپنے بچوں کو پروں میں چھپا لیتی ہے! یہ حرکت اس قدر بے ساختہ تھی۔ کہ میں حیران رہ گیا۔ اس سے زیادہ نفرت کا اظہار اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ اپنے بچے کو ایک جرمن کے پاس بٹھانا بھی گوارا نہ ہُوا! حقیقت یہ ہے۔ کہ میں نے ایسی سخت نفرت کسی ایک قوم کو دوسری قوم سے نہیں دیکھی۔ جیسی فرانسیسیوں کو جرمنوں سے ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ فرانس کسی معاملہ میں برطانیہ سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ اور ڈرتا ہے۔ کہ برطانیہ جرمنی کی باگیں ڈھیلی نہ کر دے۔ چنانچہ بعض فرانسیسیوں نے ہم سے یہ صورت حال صاف الفاظ میں بیان کی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں + فرانسیسیوں میں عام طور پر تصنع اور مکر بہت کم ہے۔ اگو مکر و تصنع کی مثالیں خصوصاً سیاسیات میں ناپید نہیں ہیں۔ آخر وہ بھی تو یورپ

ہی میں رہتے ہیں!) اسی لئے وہ اپنی حالت کو چھپاتے نہیں۔ اخلاقی طور پر ہمیں کوئی فرانسیسی ایسا نہیں ملا۔ جس نے ترکوں کے حقوق کا اعتراف نہ کیا ہو۔ اور جو ناانصافیاں ان کے ساتھ کی گئی ہیں۔ اور کی جارہی ہیں۔ ان کو بُرا نہ کہا ہو۔ تاہم ممکن ہے۔ کہ کسی وقت فرانسیسیوں کے ان منصفانہ خیالات سے ترکوں کو کوئی فایدہ پہنچ سکے۔ گو اب تک نہیں پہنچا ہے۔ لوزین کی کانفرنس میں یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی۔ کہ ترکوں کے ساتھ فرانس کا ادعائے دوستی عام سیاسی مصالح کا ماتحت ہے۔ اور یہ کہ جب مخالفت میں فایدہ کی کوئی صورت نظر آئے فرانس ترکوں کا ساتھ چھوڑنے کے لئے تیار ہے۔ جب کانفرنس کے موقع پر فرانس کو یہ اُمید ہوئی۔ کہ انگلستان جرمنی کے متعلق اس کے طرز عمل پر نکتہ چینی نہ کرے گا۔ فوراً ہی وہ ترکوں کی اخلاقی اعانت سے بھی دستکش ہوگیا۔ اور یہ امر واقعہ ہے۔ کہ فرانس نے وفعتاً باوجود وعدوں کے کانفرنس میں ترکوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ نومبر ۲۲ء میں مَیں ۱۲ دن کے لئے لوزین گیا تھا۔ جبکہ وہاں کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ دوران قیام میں خود ہز ایکسیلنسی عصمت پاشا اور دیگر اراکین وفد انگورا کی مفصل ملاقاتیں ہوئیں۔ اور جو حالات وہاں جاکر معلوم ہوئے۔ ان کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کے اوراق کی ضرورت ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ جو کچھ میں نے اپنے دوسرے سفر یورپ کے سلسلہ میں لوزین جاکر دیکھا۔ اس کا عشر عشیر بھی مسلمانان ہند کے پیش نظر نہیں۔ وہ ایک نئی دُنیا ہے۔ اور ایک نئی زندگی ہے۔ جو ترکی وفد کے اراکین کے اندر نظر آئی۔

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائیگی!

غازی مصطفےٰ کمال کے نمائندے پیرس میں معتد بہ کام کر رہے ہیں۔ اور ڈاکٹر رشاد وغیرہ نے سیاسی حلقوں میں اچھا اثر پیدا کر لیا ہے ؞

فرانس میں سب سے بڑی آسانی یہ ہے۔ کہ ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنا خیال بیان کر سکتا ہے۔ اور پیرس سے بیٹھ کر تمام یورپ میں مطالبہ حق و انصاف کی آواز پہنچ سکتی ہے۔ اسی لئے میں اس تجویز کو ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمانان ہند کا ایک نمائندہ بھی وہاں رہا کرے۔ اور وہاں رہ کر اس ملک کے خیالات کی اشاعت و تبلیغ کر سکے۔ یہ کام جس آسانی سے پیرس میں ہو سکتا ہے۔ شاید کسی ملک میں نہیں ہو سکتا ؞

غرضکہ پیرس اور پیرس والوں کو خوب دیکھا۔ اور حسرت رہی کہ کچھ نہ دیکھا سب سے زیادہ افسوس مجھے عجائب خانہ[1] اور کتب خانہ کے نہ دیکھ سکنے کا ہے۔ عجائب خانہ دنیا کے بہترین مصوروں کے صناعیوں کا گنجینہ ہے۔ اور کتب خانہ کی نسبت کہا جاتا ہے۔ کہ غالباً دنیا میں سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ ۳۵ لاکھ کتابیں ڈیڑھ دو لاکھ قلمی نسخے۔ ۳ لاکھ کے قریب نقشے اور اس کے علاوہ بہت

[1] دوسرے سفر میں جب ۸ ماہ تک خاص پیرس میں مقیم رہا یہ مقامات بھی خوب دیکھے۔ عجائب خانہ لوور واقعی عجائب خانہ ہے۔ وہ صناعی اور مصوری کا ایک عجیب غریب خزانہ ہے۔ اور اس کے ذخائر کی وسعت کا یہ عالم ہے۔ کہ میں ۸ ماہ میں کم و بیش دس دفعہ وہاں گیا۔ اور ہر دفعہ پورا دن صرف کیا۔ لیکن شاید نصف سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔ حال ہی میں اس عجائب خانہ میں ایک مشرقی صیغہ بھی کھولا گیا ہے۔ اُس کے اندر مشرقی ممالک کی صناعیوں کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔ لیکن ہر قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ مغرب مشرق کو نہیں سمجھتا۔ نہیں جانتا۔ نہیں سمجھ سکتا۔ اور نہیں جان سکتا۔ اس کی تفصیل کسی دوسرے موقعہ پر عرض کروں گا ؞

کچھ یہ گراں بہا علمی خزانہ اہل ذوق کی جنت ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کتب خانہ میں اسلامی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ ہے بہت سے ایسے قلمی نسخے ہیں۔ جن کا نام اہل علم سنتے ہیں۔ مگر ایک پرزہ کہیں نہیں مل سکتا۔ یورپ کے اہل قلم ان نسخوں سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ہندوستان کے عربی درسگاہوں میں جہاں بڑے بڑے اہل علم جمع ہیں خبر ہی نہیں۔ کہ پیرس میں کوئی ایسا کتب خانہ بھی ہے۔ جہاں قلمی اوراق میں اسلام کی بہترین مصنفین و حکما کی دماغ سوزیاں اب تک محفوظ ہیں۔ ہندوستان کے سب سے بڑے مدرسہ کا کتب خانہ ایک دفعہ دیکھا تھا۔ اس کا مایۂ ناز ایک الماری تھی۔ جس میں مصر کی مطبوعہ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور باقی درسی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ بس۔ میں نے چاہا تھا۔ کہ پیرس کے کتب خانہ میں جو قلمی نسخے عربی یا فارسی کے ہیں۔ ان کی ایک فہرست مل جائے۔ مگر اس زمانہ میں کسی تعطیل کی وجہ سے کتب خانہ بند تھا۔

القصہ ایک ہفتہ تک فرانس کی دارالسلطنت میں اور فرانسیسی تہذیب و تمدن کے مرکز پر جو کچھ دیکھ سکے خوب دیکھا۔ اور اس کے بعد ۱۶۔ اپریل کو وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن پر ترک احباب نے خدا حافظ کہا۔ اور شب بھر ٹرین میں گزار کر دوسری صبح کو میں اور ڈاکٹر انصاری صاحب سویزرلینڈ کی سرحد میں داخل ہوئے۔

اس سارے سفر میں جو چیز سب سے زیادہ بے لطف اور بدمزہ کرنے

والی تھی۔ وہ سرحدوں پر پاسپورٹ کا معائنہ اور اسباب کی تلاشی تھی۔ ہر ملک کی سرحد پر داخل ہوتے ہی بلکہ داخل ہونے سے پہلے ہی نامہ اعمال کی طرح اوّل پاسپورٹ کا معائنہ کرائیے اس کے بعد اپنے اسباب سفر کو کھولئے اور ہر چیز دکھائیے۔ (ایسا نہ ہو کہ آپ کوئی معمولی چیز یا کوئی ایسی شئے جس کے داخلہ کی ممانعت ہے لئے جا رہے ہوں) پھر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ ہر ملک میں ایک نئی زبان۔ انگریزی سے کام چلنا مشکل۔ فرانسیسی میں کچھ شُد بُد ہو تو خیر۔ ورنہ گونگے۔ بہروں کی طرح اشاروں سے کام چلائیے۔ محاصل خانہ اور پاسپورٹ کا دفتر ایک مینارہ بابل ہوتا ہے۔ قسم قسم کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور ہر شخص زبان سے اشاروں سے اور نظر سے جس طرح ہو سکتا ہے اپنا مطلب سمجھاتا ہے۔ سویزرلینڈ کی سرحد پر میں تو بدحواس ہو گیا۔ گاڑی جانے کے لئے تیار۔ سامان محاصل خانہ میں۔ پاسپورٹ ایک پولس کا آدمی لے گیا تھا۔ وہ لایا نہیں۔ فرانسیسی زبان کے دو چار ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولتے ہیں مگر کوئی نہیں سمجھتا۔ اشارے کرتے ہیں تو بھی مطلب براری نہیں ہوتی۔ راستہ معلوم نہیں۔ کس سے پوچھیں۔ غرض اس سفر کے لطف کی ساری کسر ان موقعوں پر نکل جاتی تھی۔ ۱۷۔ اپریل کی صبح کو جنیوا پہنچے۔ اور چند گھنٹہ وہاں قیام کر کے شام کو پانچ بجے روانہ ہو گئے اور دو گھنٹہ بعد ترتیتے پہنچ گئے۔ جہاں تین چار دن ٹھہر کر ترک بھائیوں سے بھی ملنا تھا۔ اور سویزرلینڈ کی سیر بھی کرنی تھی۔ جنیوا میں ڈاکٹر بسیم عمر پاشا ترکی انجمن ہلال احمر کے صدر موجود تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب بخار میں مبتلا تھے۔ اس لئے میں ان کے ہوٹل کو گیا۔ اور ان کو موجود نہ پا کر ایک پرچہ چھوڑ آیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بیچارے تشریف لائے۔ اور عرصہ

تک نہایت محبت سے باتیں کرتے رہے۔ معمر بزرگ ہیں اور فن طب میں بہت مشہور ہیں۔ یہاں تک کہ یورپ کے بہترین ڈاکٹروں میں ان کا شمار ہے۔ اب صرف انجمن ہلال احمر کے ذریعہ سے اپنے ملک کی خدمت کرتے ہیں۔ باقی سیاسی مشاغل سے کنارہ کش ہیں۔ ان سے یونانیوں کے مظالم کی ایک خون کو کھولا دینے والی داستان سُنی۔ شام کو ۵ بجے جنیوا سے چلدیئے اور رات کو ۸ بجے تریتے پہنچ گئے۔ وہاں ہم کسی سے واقف نہ تھے۔ مگر پیرس سے بعض دوستوں نے اطلاع کردی تھی۔ اور اسعد بے ہمارے منتظر تھے۔ بیچارے اسی وقت ڈھونڈتے ہوئے ہوٹل میں پہنچے۔ جہاں ہم پہنچ چکے تھے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی اسعد بے نے ہمارے قیام کے لئے خاص طور پر کمروں کا انتظام خود کیا تھا۔ اور گویا اس طرح ہم کو اپنا مہمان بنا لیا تھا۔ آتے ہی انہوں نے فرمایا۔ کہ میرا مکان ہوٹل کے متصل ہے۔ کھانا وہاں تیار ہے۔ چلئے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کی صحت اچھی نہ تھی۔ ہم نے معذرت کی۔ اور وعدہ کیا۔ کہ علی الصباح آئیں گے۔ صبح ہم باہر جانے کے لئے تیار بھی نہ تھے۔ کہ اسعد بے معہ چند اور احباب کے تشریف لے آئے پہلے یہ بتا دوں کہ اسعد بے مارشل فواد پاشا کے فرزند ہیں جو سلطان عبدالحمید خان کے زمانہ میں ایک بڑی شخصیت رکھتے تھے۔ اور اب بھی قسطنطنیہ میں وہ ایک بڑی حیثیت والے شخص سمجھے جاتے ہیں۔ خود اسعد بے عرصہ تک فوجی خدمت انجام دے چکے ہیں۔ اور پہلی جنگ بلقان میں بھی شریک ہو چکے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ اور خوشرو نوجوان ہیں۔ طلعت پاشا مرحوم کے علاوہ متعدد وزراء کے پرائیویٹ سکرٹری بھی رہ چکے ہیں۔ اور نوجوان ترکوں سے خاص تعلقات رکھتے ہیں۔ اتحادیوں

کے دست دراز سے بچ کر سوئیزر لینڈ میں پناہ گزیں ہیں۔ ترکوں کے اسلامی اخلاق و محبت کا ایک دل آویز نمونہ ہیں۔ اوران سے زیادہ اُن کی اہلیہ محترمہ شہزادی زیبا اسعد جن کے اندر میں نے اسلامی نسوانیت کی ایک سچی تصویر دیکھی۔ موجودہ سلطان مصر کی بھتیجی ہیں۔ اور بہت دولت مند ہیں۔ مگر ان کی سادگی۔ مذہبی اور قومی جوش اور اسلامی محبت نے ہمارے دلوں میں ایسے نقش بنا دیئے ہیں۔ جو کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ میرے دل میں تو ان تمام احباب کی خوبیاں دیکھ دیکھ کر بار بار وہی ایک سوال پیدا ہوتا تھا۔ کہ ان کے مرد ایسے اور خواتین ایسی۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ترک دُنیا میں عزت کے ساتھ زندہ نہ رہ سکیں؟ ہم چار دن ترنیٹے میں رہے۔ اسعد بے کے مہمان تھے۔ دونوں وقت ان ہی کے مکان پر کھانا کھاتے تھے۔ شاہزادی زیبا کی مہمان نوازیوں کی یاد دل میں ہر وقت تازہ ہے۔ زیادہ لکھتے ڈرتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ مبالغہ سمجھا جائے۔ دو چار مثالیں کافی ہونگی۔ پہلے ہی دن کہیں ڈاکٹر انصاری صاحب نے ازراہ مذاق میری نسبت یہ کہہ دیا۔ کہ میٹھی چیزیں کھانے کا بہت شوق ہے (اور جھوٹ کیوں بولوں۔ کچھ غلط بھی نہ کہا تھا!) اس کے بعد یہ حالت تھی۔ کہ دونوں وقت کئی کئی قسم کا میٹھا دسترخوان پر ہوتا تھا۔ خود شاہزادی پکاتی تھیں۔ اور پھر اصرار کے ساتھ اس قدر کھلاتی تھیں۔ کہ ڈاکٹر انصاری تو گھبرا گھبرا کر کہتے تھے۔ کہ کہیں بیمار نہ ہو جاؤ۔ مگر اوّل تو میٹھا خود ہی ایسی چیز ہے کہ انسان کی عمر بڑھاتا ہے۔ علاوہ اس کے سچی محبت سے پکایا جائے اور محبت سے کھلایا جائے۔ ایسی حالت میں بیمار ہونا محال! چنانچہ سوئیزر لینڈ میں سفر کی ساری تکان بھی جاتی رہی۔ اور ترکی کھانوں خصوصاً میٹھے

کھانوں کا وہ لُطف اٹھایا۔ کہ اب شاید کبھی نصیب نہ ہو! برسبیل تذکرہ اگر زبان سے کہدیا۔ کہ فلاں چیز خریدنی ہے۔ تو شام کو ہوٹل میں ایک پارسل موجود ہے۔ جب ہم ان مہمان نوازیوں سے شرما شرما کر شکایت کرتے تھے۔ تو جواب ملتا تھا۔ کہ اچھا ہم ہندوستان آئیں تو تم بھی اسی طرح مہمان داری کر لینا! میں کیا بتاؤں کہ جب وہ یہ کہتے تھے۔ تو میں اپنے جی میں کس قدر محجوب و مغموم ہوتا تھا۔ ہندوستان میں مسلمان تو ہیں۔ مگر یہ باتیں کہاں ؎

چہ بود متاعِ خسرو کہ کند نثار جاناں
مگسے چہ طعمہ دارد بدہاں باز کردن!

ابھی تو ہندوستان کے مسلمان ان مجاہدین اسلام کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہے۔ جو آج صدیوں سے ناموس اسلامی کے محافظ ہیں۔ اور اُسی کے نام پر مردانہ وار اپنی جانیں دے رہے ہیں! اسعد بے اور تقریباً تمام دوسرے احباب انگریزی خوب بولتے ہیں۔ اس لئے لُطف صحبت ایسا تھا۔ کہ ترپتے کی صحبتوں سے جدا ہونا شاق گزرا ؛

اسعد بے کے مکان کے قریب ہی ایک دوسرے بھائی فواد بے بھی مقیم تھے۔ ایک معمر شخص ہیں۔ اور اچھا علمی مذاق رکھتے ہیں۔ عربی زبان کے دلدادہ ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے گھر میں بچے بھی تُرکی زبان کی بجائے عربی بولتے تھے۔ اور جب ان کو معلوم ہُوا۔ کہ ہم لوگ عربی نہیں بول سکتے۔ تو حیران ہوئے۔ اور کہنے لگے۔ کہ جس عالمگیر اتحاد اسلام کا خواب ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ وہ عربی زبان کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ فواد بے بھی دولت مند شخص ہیں۔ مصر میں مقیم تھے۔ اور جب سے سوئزرلینڈ آئے

ہیں یا آنے پر مجبور کیے گئے ہیں۔ اپنی ذاتی آمدنی کا ایک پیسہ بھی ان تک نہیں پہنچتا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے خوب صورت بچے ہم لوگوں سے خوب مانوس ہو گئے تھے۔ فواد بے کے ایک عزیز شیرین بے واقعی اسم بامسمیٰ ہیں۔ وجیہ نوجوان ہیں۔ اور فی الحقیقت شیرین ہیں اکم سخن ہیں۔ مگر جب باتیں کرتے ہیں تو دل موہ لیتے ہیں۔ اسعد بے اور فواد بے کے ان دو گھروں میں میری زندگی کے یہ تین چار دن بہترین تھے۔ جو گزر گئے۔ یہ ایک حسن اتفاق تھا۔ کہ فواد بے مفتی عبدہٗ کے شاگرد نکلے۔ اور اس سلسلے سے اُستاد اعظم حضرت جمال الدین افغانی کے حالات سے بھی خوب واقف تھے۔ میں ایک عرصہ سے سید جمال الدین کی سیرت مرتب کر رہا ہوں۔ اور چاہتا ہوں۔ کہ جو کچھ بھی میری محدود قابلیت ہے۔ وہ سب اُس کی ترتیب و تکمیل میں صرف ہو جائے۔ اور جس پایہ کا وہ شخص تھا۔ اسی شان کی ایک کتاب تیار ہو سکے۔ لیکن یہ تنہا میرے بس کا کام نہیں۔ جہاں جہاں سے ممکن ہوتا ہے معلومات حاصل کرتا جاتا ہوں۔ اس کی ترتیب کا وقت آئے گا تو کسی بڑے شخص کی خوشہ چینی کروں گا۔ مجھے فواد بے سے بہت سے حالات معلوم ہوئے۔ اور ایک دن میں نے کئی گھنٹہ اسی کام میں صرف کئے۔ اور سید جمال الدین کے متعلق جو کچھ ان کے دماغ میں محفوظ تھا حاصل کر لیا۔

اسعد بے سے اکثر سیاسی اور اسلامی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اور نوجوان ترکوں کے متعلق بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہو سکیں۔ چونکہ انقلاب کے بعد جنگ بلقان کے اختتام تک اسعد بے خود نوجوان ترکوں کی جماعت کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ اس لئے ان کے بیانات بہت زیادہ قابل وثوق پائے

علاوہ بریں میں نے محسوس کیا۔ کہ اسعد بے کبھی گفتگو میں کسی کے خلاف یا موافق ضرورت سے زیادہ جوش یا تشدد نہیں کرتے۔ انہوں نے نوجوان ترکوں کے اوصاف بھی بتائے اور انکی غلطیاں بھی بتائیں۔ اور ان سے معلوم ہُوا۔ کہ سب سے بڑی ٹھوکر جو ترکوں نے کھائی تھی۔ وہ یہی تھی۔ کہ تحریک اتحاد اسلامی سے قطع نظر کرکے وہ تحریک اتحاد تورانی پر زور دیتے رہے۔ اور اس طرح چاہتے یہ تھے۔ کہ ترکوں کی ایک جغرافی قومیت قائم ہو جائے۔ جس میں ہر مذہب شامل ہو اور جو خارجی اُمیدوں سے بے نیاز ہو۔ ہندوستان میں بھی بعض دوست اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہندوستانی قوم پرست صرف وہی ہو سکتا ہے۔ جو تمام خارجی تعلقات سے قطع نظر کرلے۔ حالانکہ حُبِ وطن کے لئے میرے خیال میں یہ شرط لازمی نہیں ہوسکتی۔ اس عالمگیر اخوت کے شیرازہ کو درہم وبرہم کرکے مسلمان اپنی قومیت کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیں گے۔ اُس کے بعد انکی نمایاں خصوصیت کوئی باقی نہیں رہتی۔ جو ان کے قومی اقتدار کو قائم رکھے۔ اس اصلی قومیت کو قائم رکھ کر ہی ہندوستان کے مسلمان ملک کی متحدہ قومیت کا با اثر جزو ہو سکتے ہیں۔ ورنہ انکی قیمت کچھ نہ ہو گی۔ اور جب قیمت نہ ہو گی۔ تو وہ ملک کے سرمایہ میں حصہ دار کیونکر ہو سکتے ہیں! قومیت کا یہ غلط تخیل جس قدر جلد محو ہو جائے بہتر ہے۔ یہ موقعہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنے کا نہیں ہے۔ لیکن انشاء اللہ سید جمال الدین کی سیرت میں۔ جو تحریک اتحاد اسلامی کے سب سے بڑے داعی تھے۔ میں اس بحث کو بہت زیادہ صاف کردوں گا۔

اسعد بے سے طلعت پاشا اور انور پاشا کے بہت سے حالات معلوم ہوئے

اور بر سبیل تذکرہ انہوں نے بیان کیا۔ کہ مصطفٰے صغیر نامی ایک شخص انگورا گیا ہُوا ہے۔ جہاں پہلے دھوکہ ہُوا۔ مگر اب پتہ چلا ہے۔ کہ وہ کوئی جاسوس ہے۔ غالباً یہ وہی مصطفٰے صغیر ہیں۔ جن کی گرفتاری اور سزائے موت دیئے جانے کی خبریں کچھ عرصہ ہُوا ہندوستان آئی تھیں۔ ہم نے تریستے میں سُنا۔ کہ یہ حضرت عرصہ سے سارے یورپ کا چکر لگا رہے تھے۔ اور ہر جگہ ترکوں سے ملتے تھے۔ اور ظاہر کرتے تھے۔ کہ میں ہندوستان کے وطن پرستوں کا نمایندہ ہوں۔ اور کار خاص پر متعین ہوں![1]

۲۱۔ اپریل کی صبح کو ہم بادل ناخواستہ تریستے سے رخصت ہوئے۔

رومۃ الکبریٰ

وادی سمپلن کی سرنگ سے (جو دُنیا کی سب سے بڑی سرنگ کہی جاتی ہے) ہماری ٹرین ایک گھنٹہ میں گزری اور اب ہم اٹلی کی سرحد کے اندر داخل ہو گئے۔ اطالوی تہذیب کا پہلا نمونہ میلان سٹیشن پر دیکھا۔ جہاں ہم گاڑی بدلنے کے لئے دو گھنٹہ ٹھہرے تھے۔ کھانا کھانے کے لئے اسٹیشن کے ہوٹل میں گئے۔ اطالوی سوسائٹی کا وہ پہلا منظر ہمیشہ یاد رہے گا۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ نقش اوّل زیادہ قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ مگر بعض طبائع نقش اوّل سے بہت کچھ استنباط کر لیتے ہیں۔

اُس شب کو میلان اسٹیشن کے ہوٹل میں میں نے سیکڑوں اطالوی مردوں

---

[1] مصطفٰے صغیر صاحب نے ہندوستان کی نمایندگی کا حق جس قابلیت کے ساتھ انگورا میں ادا کیا۔ اسکی حقیقت واضح ہو چکی ہے۔

اور عورتوں کو کھانا کھاتے دیکھا۔ اُس منظر کی بدتمیزی اور گندگی بیان سے باہر ہے۔ ہمارے پاس ہی لوگ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ اور اس طرح گوشت کے ٹکڑوں کو دانتوں میں لے کر چیرتے اور ہڈیوں کو چباتے تھے۔ کہ بے اختیار یورپ کا عہد وسطےٰ یاد آتا تھا۔ ایک چیز ہمارے ہندوستان کی سوئیں کی صورت کی۔ مگر نمکین اور ہندوستان کی موٹی سے موٹی سوئیں سے بھی بیس گنی زیادہ موٹی رکابیوں میں بھر بھر کر لائی جاتی تھی۔ اور وہ خدا کے بندے اس شوق سے اس کو کھاتے تھے۔ کہ گویا ایک نعمت ہے۔ بعد کو معلوم ہُوا۔ کہ (Macaroni.) اطالوی قوم کا قومی کھانا ہے۔ اور اِن کو بہت ہی مرغوب ہے۔ کچّا آٹا۔ اسکی موٹی موٹی سوئیں بالکل مونج کی رسّی کے ٹکڑے۔ ان میں نمک مرچ پڑا ہُوا رکابی سے منہ تک لٹکتے ہوئے جاتے تھے۔ اور پھر جبڑے بھی چلتے تھے۔ اور ان ٹکڑوں کا ایک حصّہ مُنہ کے باہر بھی لٹکتا رہتا تھا۔ جیسے جانوروں کے مُنہ سے گھانس چھُری کانٹا میز پر ہوتا ہے۔ مگر اِن اشیا کا استعمال کچھ برائے نام ہے۔ سوائے اچھے ہوٹلوں کے جہاں ذرا صفائی کا زیادہ خیال معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ زیادہ بھی اتنا۔ کہ ہم ہاتھ سے کھانے والے لوگ پھر بھی اس کو گندگی اور بدتمیزی سمجھتے تھے! خدا کی پناہ! اُس دن کسقدر مشکل سے چند نقمے کھائے۔ ہوٹل کی وہ غلاظت اور کھانے والوں کی وہ بدتمیزی وہ ہجوم۔ وہ شور۔ جبڑوں کے چلنے کی وہ آواز! معاذ اللہ!

سُنا تھا۔ کہ اطالوی حسین ہوتے ہیں۔ مگر ہم نے تو حُسن کے آثار بھی کم دیکھے۔ البتہ یہ ضرور دیکھا۔ کہ عورتیں فرانس کی وضع و قطع کا مُنہ چڑاتی ہیں! اور ہر جگہ تھیٹروں اور بازاروں میں اسکی کوشش و خواہش نظر آتی ہے۔ کہ پیرس

کی نقل اُڑائی جائے ؛

ہم میلان سے دوسری گاڑی میں سوار ہو کر صبح کو روما پہنچے۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد طبیعت کو بدمزہ کرنے والا پہلا واقعہ تو یہ پیش آیا۔ کہ ہمارا جو سامان بعد کو اسٹیشن سے لایا گیا۔ اس کو چنگی کے اہلکاروں نے اس بری طرح کھولا اور دیکھا تھا۔ کہ بعض چیزیں ٹوٹ گئیں۔ بعض کپڑے خراب ہو گئے۔ اور پھر گودڑ کی طرح بکسوں میں بھر دیئے گئے !

تیسری چیز یہ معلوم ہوئی۔ کہ ہوٹل کے ملازمین (حالانکہ وہ ہوٹل ایک اچھا ہوٹل سمجھا جاتا ہے) تقریباً سب کے سب مسافروں کی ناواقفیت سے بہت زیادہ ناجائز فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں۔ کہ جس کسی کی جیب میں ہاتھ پڑ سکے کچھ حاصل کر لیں۔ بعد کے تجربوں نے بتایا۔ کہ اہل اطالیہ (خصوصاً شہری آبادی) عام طور پر بہت طامع اور خود غرض ہوتے ہیں !

اب صرف دو چیزیں بیان کروں گا۔ اوّل روما کے آثار قدیمہ جن کو اچھی طرح دیکھا۔ اور عبرت کی نظر سے دیکھا۔ دوسرے ترک احباب کی ملاقاتیں !

روما کی پُرانی دیواروں اور شکستہ عمارتوں پر گویا ہزاروں برس کی تاریخ کندہ ہے ! اہل نظر ان آثار قدیمہ میں جس سے سارا شہر بھرا پڑا ہے۔ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ روما کی تاریخ درحقیقت دُنیا کی تاریخ ہے۔ میں جو کچھ کتابوں میں پڑھ چکا تھا۔ سب ان آثار کو دیکھ کر تازہ ہو گیا۔ ان مقامات کے دیکھنے میں مجھے ایک عجیب لطف آتا تھا۔ جو تاریخی واقعات کتابوں میں پڑھے تھے۔ وہ گویا نظر کے سامنے تھے۔ سیزر کہاں قتل کیا گیا تھا۔ انٹونیس نے کس جگہ کھڑے ہو کر تقریر کی تھی۔ نیرو نے کن عمارتوں کو جلا کر راکھ کیا تھا۔

سینٹ پیٹرس کہاں مارے گئے تھے۔ اور کیونکر دفن ہوئے تھے۔ کلیڈیس جس نے قوم گوتھ کے تین لاکھ نفوس کو تہ تیغ کیا تھا۔ (اس عہد جدید کی خوں آشامیوں کے مقابلہ میں وہ قتل عام ایک کھیل ہوگا!) کس جگہ دربار کرتا تھا۔ وہ پل کس موقعہ پر تھا۔ جس پر ہورشیس نے پورسینا کی فوجوں کو روکا تھا۔ وغیرہ وغیرہ پورے ڈھائی ہزار برس کی تاریخ پیش نظر تھی۔ اور خدا یاد آتا تھا!

روما کی تاریخ قدیم کے راز اسکی اینٹوں میں پنہاں ہیں۔ کوئی پتھر نہیں جس پر خون کے دھبے نہ پڑے ہوں۔ ہر گھر کسی نہ کسی دردناک واقعہ کی یادگار ہے۔ ہر پرانا درخت ایک گواہ ہے جس نے بہت سے خوفناک مناظر دیکھے ہوں گے۔ ہر پھول جو اُس سر زمین پر اُگا ہُوا ہے۔ اس نے مٹی میں جذب ہو جانے والے خون سے زندگی پائی ہوگی۔ اور وہ جب کھلتا ہے۔ تو گویا کسی نہ کسی قبر پر کھلتا ہے!

رومۃ الکبریٰ کے بانی دو جنگلی انسان بتلائے جاتے ہیں۔ جن کو ایک بھیڑیے نے پرورش کیا تھا۔ شہر کے خاص خاص مقامات پر ایک تصویر اکثر نظر آتی ہے جس میں دو انسان کے بچے ایک بھیڑیئے کی مادہ کا دودھ پیتے نظر آتے ہیں۔ جانوروں اور انسانوں کے بچوں کے متعلق اس قسم کی حکایتیں کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ فردوسی نے رستم کے بیٹے کو کوہ البرز کی چوٹی پر عقاب کے گھونسلے میں پرورش کرایا۔ نینوا کی سلطنت کے بانی کو اس کے بچپن میں فاختہ دانہ کھلاتی تھی۔ خود ہندوستان میں اس طرح کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ وسط ہند کے گونڈوں کی زندگی بھی شیر کی حکایتوں سے وابستہ ہے۔ غرض یہ کوئی نیا توہم نہیں ہے۔ مگر اٹلی میں تو رومیلس اور ریمس اور بھیڑیئے کی مادہ

(اجوان کو دودھ پلاتی تھی۔) قومی تاریخ کا ایک جزو ہو گئے ہیں۔ اور انکی تصویر ایک قسم کا قومی نشان سمجھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک دو مشہور عمارتوں کے دروازوں پر کٹھروں میں زندہ بھیڑیئے بند ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا۔ کہ وہ اطلاوی قوم کی "گرگ زادگی" (اگر اس اصطلاح کا استعمال کرنا بیجا نہ ہو) کا قومی نشان ہیں! درحقیقت اہل روما "گرگ زادہ" یا "پروردہ آغوش گرگ" ہیں یا نہیں۔ خدا کو معلوم ہے۔ مگر جن لوگوں نے جنگ طرابلس کے حالات پڑھے ہیں۔ وہ تو ایک حد تک انکی درندگی سے انکار نہیں کر سکتے!

یورپ میں کہتے ہیں۔ کہ اگر انسان کے کیریکٹر و اخلاق کا اندازہ کرنا ہو تو آدمی کو اس وقت دیکھئے۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھے۔ میں نے اطالوی مرد اور عورتوں کو گوشت اور تقریباً کچے گوشت کے ٹکڑے دانتوں سے چیرتے پھاڑتے دیکھا ہے! بہرحال رومیلس اور ریمس کی اولاد بھیڑیئے کی خصوصیات سے دو ہزار برس بعد بھی محروم نہیں ہوئی ہے۔ گو اب ان کے جسم کے لمبے بال باقی نہیں۔ اور صدیوں تک انسانی تہذیب و تمدن کے سایہ میں پرورش پاکر اب ایک اچھا ملمع ہوگیا ہے۔ تاہم وہ کچھ نہ کچھ اپنی دایہ کی روایات کو روشن رکھتے ہیں! روما الکبریٰ کی سات پہاڑیوں پر آج جو آبادی پھیلی ہوئی ہے اس کا رشتہ عہد ماضی کی بہیمیت سے منقطع ہُوا ہو مگر بالکل منقطع نہیں ہُوا۔ کچھ نہ کچھ باقی ہے!

روما الکبریٰ کی ابتدا یوں ہوتی ہے:-

چند چرواہوں نے کسی پہاڑی پر اپنا گاؤں آباد کیا۔ اور قضا و قدر نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈال دی جس کے تاجداروں نے صدیوں تک دُنیا میں نور و ظلمت کے ہنگامے برپا رکھے! جس طرح آدم کی عمر میں پہلی

دفعہ عورت نے انقلاب پیدا کیا تھا۔ جس کے تلخ ثمرات آج ہم کو کھانے پڑ رہے ہیں۔ اسی طرح روما کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک عورت نے انقلاب عظیم پیدا کیا۔ وہ قصہ بہت دلچسپ ہے۔ ایک حسین عورت کا حُسن ولیعہد سلطنت کو بے اختیار کر دیتا ہے۔ اور وہ نوجوان رات کو برہنہ تلوار لیکر اُس عورت کے سرہانے جاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ میں اس سلطنت کا ولی عہد ہوں۔ تلوار میرے ہاتھ میں ہے۔ تیری عصمت آج کی شب میری تلوار پر قربان ہونی چاہیئے! اُس عورت کا غرور نسوانیت چمکتے ہوئے فولاد سے مرعوب نہیں ہوتا۔ مگر وہ شاہزادے کی بہیمانہ طاقت سے ناچار مغلوب ہوتی ہے۔ اور صبح کو اپنے شوہر اور باپ کے سامنے اپنی رسوائی کا حال سُنا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ اس کی لاش سامنے پڑی ہے۔ اور بروٹس اسی چھری کو اُٹھا کر جس سے ابھی ابھی اس عورت نے اپنا کام تمام کیا ہے۔ قسم کھاتا ہے۔ اور کہتا ہے "اُس معصوم خون کی قسم جو اس چھری سے ٹپک رہا ہے۔ دیوتا میرے گواہ ہیں۔ میں مغرور تارکوین سے انتقام لوں گا۔ اُس سے اور اسکے اہل و عیال سے یہ چھری انتقام لیگی۔ اور اس چھری کی قسم اور اس خون کی قسم آیندہ وہ مغرور اور اسکی اولاد میں سے کوئی اس ملک پر حکومت نہ کر سکے گا"!

وہ لاش سر بازار رکھی ہوئی ہے۔ اور ہزاروں انسان آتے ہیں۔ اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کا حلف اُٹھاتے ہیں۔ اس طرح ایک خونین عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ اور آخر حکمران خاندان کا ایک بچہ بھی ملک میں باقی نہیں رہتا۔ اور اہل ملک اپنی ایک جمہوریہ قایم کرتے ہیں۔ یہ دو ہزار برس کا واقعہ ہے۔ لیکن آج بھی اس عورت کا نام تاریخوں میں روشن ہے۔ جس کے خون نے ایک حکمران خاندان شاہی کی بنیادیں ہلا دیں! اُس واقعہ کو

داستان کہن کیوں کہئے۔ انسانوں کے دلوں میں مظلومیت اور انصاف کے جذبات کو بلکہ تمام جذبات عالیہ کو عورت ہی ہمیشہ پیدا کرتی ہے۔ وہ قوم کہاں ہے۔ جسکی قومیت عورت کے انقلاب انگیز وجود کی مرہون منت نہ ہوا جب روما کی سر زمین پر دولت کے کرشمے نظر آنے لگے۔ اور حکومت وطاقت کا دائرہ وسیع ہو چلا۔ انسان انسان کو غلام بنانے لگے۔ اور غلامی کا دہشتناک عہد شروع ہو گیا۔ جب لاکھوں انسان کتوں سے بدتر حالت میں مبتلا ہو گئے یہ وہ عہد تھا جس کے اثرات نے تمام یورپ کو بدترین بہیمیت میں مبتلا کر دیا۔ اور حیوانیت کی اُن شرمناک خود پرستیوں میں تمام برّاعظم کو گندہ کر دیا جسکی ایک ادنیٰ مثال آندلس کی مذہبی عدالتیں تھیں۔ اگر عرب میں اسلام کی روشنی نمودار نہ ہو گئی ہوتی۔ تو شاید آج ساری دُنیا اس غلامی کے زنجیروں میں گرفتار ہوتی ا وہ زمانہ تھا۔ کہ حکومت روما کی فتوحات کا سلسلہ یونان تک پہنچ چکا تھا۔ اور مفتوحہ ممالک سے ہزارہا غلام پابہ زنجیر آتے تھے۔ اور بازاروں میں ترکاریوں کی طرح فروخت ہوتے تھے۔ اہل روما یونان کی عظمت اور اس کے علم وفضل اور اسکی صناعیوں کو دیکھ کر حسد کرتے تھے۔ وہ دماغ ان کو نہیں ملا تھا۔ جس نے اہل یونان کو دُنیا کا استاد بنایا۔ لیکن روما کو یونانیوں کی علمی عظمت کا بہتر نمونہ بنانے کی خواہش رومیوں کو ملک گیری پر آمادہ کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ یونان کے بہترین خزانے صنعت وعلم کے بہترین ذخایر جو وہاں جمع تھے۔ روما کی فاتح فوجوں کے ذریعہ سے اطالیہ میں لائے گئے۔ اور آج تک موجود ہیں۔ صرف ایک فاتح مرکس فلویس اپنے صرف ایک حملہ کے بعد تاریخ ہم کو بتاتی ہے۔ کہ سیکڑوں من سونا۔ کروڑوں طلائی سکے۔ ۲۸۵ فولادی مجسمے (قدآدم) ۲۳۰ سنگ مرمر کے مجسمے۔ تصویریں اور صناعی کے بہترین نمونے

روما میں لایا۔ اس طرح وہ خزانے جمع ہوئے جن کا ایک عکس آپاپا کے عجائب خانے میں سیاح کو نظر آتا ہے۔ اطالوی قوم کے اندر جوہر اصلی نہ جب تھا نہ اب ہے۔ مگر انہوں نے یونان کی نقل شروع کی۔ اور خوب کی۔ اطالیہ کی تاریخ کا مطالعہ مجھے اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ کہ بلحاظ شعور اور دماغ یہ قوم کبھی کوئی بلند پایہ نہ رکھتی تھی۔ البتہ اس نے کسی حد تک یونان کے کمالات کی نقل اُتاری۔ اور اسی سلسلہ میں دو چار ایسے صناع اور مصور بھی پیدا کئے جو اپنی مخصوص دماغی قابلیت پر ناز کرنے کا حق رکھتے تھے۔ بحیثیت مجموعی اور از روے انصاف سواے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ روما میں سپاہی تو تھے۔ مگر اہل علم کبھی نہ تھے۔ تلوار تھی۔ قلم نہ تھا۔ اور ایک قومی خصوصیت اور بھی تھی۔ وہ معمار تھے۔ اور عمارتوں سے اپنی قومی عظمت جتلاتے تھے۔ ان کی نظر میں عظمت کا معیار ہر چیز کی جسامت یعنی عمارتوں کی خوبصورتی ہو یا نہ ہو۔ مگر ان کی بلندی۔ انکا جسم۔ ان کے محرابوں کی وسعت۔ انکا استحکام یہ چیزیں تھیں جو قومی فخر و نخوت کی مُظہر تھیں +

ایک فلسفی جب اس کلیہ کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ تہذیب و تمدن اور معاشرت۔ اور ان سب کی دایہ دولت۔ جسقدر زیادہ بڑھتی ہے۔ اسی قدر حیوانیت اور بد اخلاقی بھی ترقی پاتی ہے۔ تو بظاہر یہ دو چیزیں کس قدر متضاد نظر آتی ہیں۔ مگر فلسفی کے اس کلیہ کو ثابت کرنے کے لئے تاریخی واقعات کا ایک نا انتہائی سلسلہ پیش نظر ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کی اعلیٰ یورپین تہذیب نے انتہائی بہیمیت کے جو مناظر دُنیا کے سامنے پیش کئے وہ کوئی نئی چیز نہیں۔ دنیا میں اکثر یہی ہوتا رہا ہے۔ انسان کا تمدن جب زیادہ اعلیٰ اور اسکی معاشرت زیادہ پُر تکلف اور اس کے علوم و فنون زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ تو نفس لئیم بھی زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ سلطنت روما کی عظمت کا وہ زمانہ جب دنیا

کے نظریں رومتہ الکبریٰ کے دروازوں پر لگی رہتی ہیں۔ اور مسیحیت کا اسقف اعظم عیسائی دُنیا میں دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ دُنیا کے خزانے روما کی سڑکوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ اور تاجداروں کے سروں کو ادنیٰ ادنیٰ سپاہی ٹھکرا دیتے ہیں۔ وہ زمانہ طاقت۔ دولت اور تمدن کا بہترین زمانہ کہا جاتا ہے۔ لیکن عین اسی زمانہ میں بہیمیت اور خونخواری کی بدترین مثالیں موجود ہیں انیرو کی خون آشامیاں ان خونریزیوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھیں۔ جو مسیحیت کے مرکز پر اس عہد میں رونما ہوئیں۔ جب روما اور اُس کے اساقفت کی بلند اقبالی دُنیا میں اپنے ڈنکے بجا رہی تھی۔ دار السلطنت کی وہ تباہی کچھ بھی نہ تھی۔ جو عہد اوّل کے تاجداروں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اُس آتشزدگی اور خونریزی کے مقابلہ میں جس کا دور تہذیب و تمدن میں روما شکار ہوتا تھا۔ سولھویں اور سترھویں صدی کی رومن تاریخ اور اٹھارہویں صدی کے تمدن کا باہم تقابل اہل نظر کے لئے کچھ ایسا مشکل نہیں ۔۔

مسیح کے جانشین جو مسند حکومت پر ہنیبال اور نیرو سے کچھ کم نہ تھے۔ اپنی روحانی چادروں کو لاکھوں انسانوں کے خون سے رنگتے تھے۔ اور ان کی عبائے تقدس پر ہوس۔ عیش پرستی اور دنیا طلبی کے ایسے دھبے لگتے تھے۔ جو آج تک عیسائی مورخین کے مٹائے نہ مٹ سکے۔ قومی کی اقبال مندی کی وہ ایک عبرت انگیز مثال ہے۔ کہ مسیحیت کا اسقف اعظم کبھی شمشیر برہنہ لے کر میدان جنگ میں مسیحی روحانیت کی داد دیتا ہے۔ اور کبھی

لہ۔ رومن کیتھولک عقاید کا مقتدا کارڈنل بیرونیس کھلے الفاظ میں کہتا ہے۔ "کہ ... سے ایسے لوگ پاپائے روما کے تخت پر بیٹھ چکے ہیں جنہیں ہم دیو اور شیطان کے نام سے بھی یاد نہیں کر سکتے۔ انکی حرکات دیووں اور شیطانوں سے بھی کئی درجہ بڑھی ہوئی تھیں"

روما کی گلیوں میں منہ چھپائے بھاگا چلا جاتا ہے۔ ایک دو نہیں مسیح کے کم و بیش بیس تیس مسند نشینوں نے اپنی زندگی کا سفر تلوار کی دھار پر ختم کیا۔ ۸۹۶ء سے ۱۸۵۹ء تک پاپائے روما کی رعایا نے جانشین مسیح کے خلاف ۱۶۱ دفعہ بغاوت کی اور دونوں طرف سے تلواریں بے نیام ہوئیں۔ اور خون کے دریا بہے!

یورپ کے عہد وسطے کی مسیحیت یہ تھی۔ جسکی یادگار آج ایک بوڑھے میاں اپنے گزشتہ اقبال کا داغ کلیجے سے لگائے ہوئے وٹیکن (پاپائے روما کا محل) میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور کبھی کبھی امن اور صلح کے چند کاغذی پیام دُنیا کو بھیجدیتے ہیں۔ جو ایسے پیاموں کو تلوار کی نوک پر مارتی ہے!

یہ تھا روما جس کو ہم دیکھنے گئے تھے۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنیوالے کتابوں کے اوراق پر اپنی ساری عمر نثار کر دیتے ہیں لیکن وہی تاریخ تمام و کمال کسی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے سایہ میں یا کسی ایک شکستہ محراب کے نیچے بیٹھکر نظر کے سامنے گزر جاتی ہے۔ میں نے روم کی تاریخ جو کچھ پڑھی وہ کچھ بھی نہ تھی۔ اس کے مقابلہ جو اپنی آنکھوں سے دیکھی!

سینٹ پیٹرس

نیرو روما کا تاجدار اُس عہد کا ہلاکو تھا۔ تاریخ اس کے ہولناک کارناموں کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ جو اس قابل ہے کہ اب بیسویں صدی عیسوی میں تمام یورپ کے دفاتر خارجہ کی دیواروں پر موٹے حرفوں میں لکھ کر آویزاں کردی جاتے۔

۶۴ء عیسوی میں نیرو نے سارے روما کو جلاکر خاک کردیا۔ اور دوسرے برس اپنے لئے ایک سنہری محل تعمیر کیا۔ جسکی چند اینٹیں اب تک پڑی ہوئی

ہیں۔ ۲۷۵ء میں شاہ آبرلین نے دار السلطنت کا ایک حصار تعمیر کرایا۔ ۳۱۲ء میں قسطنطین نے اپنے جھنڈے پر صلیب کی شکل بنائی۔ مسیح علیہ السلام کے مشہور حواری سینٹ پیٹرس کہا جاتا ہے کہ ۴۲ء میں روم آئے تھے۔ انکی تعلیمات کا اثر وفات کے ۲۷۰ برس بعد مرتب ہونا شروع ہوا۔ اور قسطنطین نے اپنے عہد میں اس عبادت گاہ کی بنیاد ڈالی جو آیندہ مسیحی دُنیا کا سب سے بڑا کلیسا سمجھی گئی۔ اور صدیوں تک مسیحی دُنیا کے عظیم الشان انقلابات کا مرکز بنی رہی۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ شاید آج دُنیا میں کوئی مذہبی عمارت اتنی خوب صورت اور اتنی بڑی موجود نہیں ہے۔ لیکن سینٹ پیٹرس صدیوں کی تاریخی تعمیر کا نتیجہ ہے۔ شروع میں ایک چھوٹا سا مقبرہ اس مقام پر بنایا گیا۔ جہاں قدیم روایات کے مطابق سینٹ پیٹرس مدفون سمجھے جاتے تھے۔ اسی کے پہلو میں نیرو کے عہد جاہلیت کا ایک مندر تھا۔ جو بعد میں منہدم کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۴۵۰ء تک مسیحیت کی یہ پہلی یادگار بدستور قایم رہی۔ لیکن وہ بہت کمزور ہو چلی تھی۔ اور اندیشہ تھا۔ کہ منہدم ہو جائے گی۔ اس زمانہ میں نکولاس پنجم پاپا کی مسند پر متمکن تھا۔ اس نے نئے نقشے تیار کرانے شروع کئے۔ اور پوپ جولیس دوم نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ جو درحقیقت دیکھنے والے کو محو حیرت کر دیتی ہے۔ پھر بھی یہ عمارت ۱۶۳۶ء تک مکمل نہ ہو سکی۔ آخر پوپ اربن ہشتم نے اس کا افتتاح کیا۔ اس وقت "مقدس سلطنت روم" کا ستارۂ اقبال بہت روشن اور بلند تھا۔ چنانچہ اس عمارت کے در و دیوار نے عیسایت کے بڑے بڑے مذہبی حاکموں کے جاہ و جلال کا منظر دیکھا۔ ایک کالا کمبل اوڑھنے والے اور اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلنے والے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جان نثاروں کو نام نہاد جانشینان مسیح اپنے عہد گزشتہ کے اس جاہ و جلال کے مقابلہ میں

کتنی ہی حقارت سے دیکھیں لیکن عالم مسیحیت میں روحانیت پر تو مسیح کے بعد ہی نفس لئیم حاوی ہو چکا تھا۔ وہاں امارت اور دولت کے کرشمے مسیح کی مسند پر بکھرے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ اسی عمارت کے وسط میں وہ مقام ہے۔ جہاں روما کے بڑے بڑے تاجدار پوپ کے قدم لیتے تھے۔ اور ان کے ہاتھوں سے اپنے سر پر تاج رکھواتے تھے۔ ساری عمارت کی وسعت و بلندی کا اندازہ ایک نظر میں کرنا بالکل ناممکن ہے۔ وسط کے فرش کا طول و عرض شاید اس طرح کچھ سمجھ میں آئے۔ کہ اگر عہد جدید کا بڑے سے بڑا جہاز وہاں رکھ دیں۔ تب بھی فرش کا کچھ حصہ خالی رہ جائیگا۔ سینٹ پیٹرس کے شہ نشینوں میں ۵۰ ہزار رومیوں کے بیٹھنے کی گنجائش بتائی جاتی ہے۔ اور یہ تخمینہ بہت قرین قیاس ہے۔ چھت کی بلندی کا اندازہ یوں کیجیے۔ کہ اگر وسطی گنبد کے اندر جو برآمدہ چھت سے ملا ہوا بنا ہے۔ اس پر کھڑے ہو جاتے۔ تو نیچے فرش پر چلنے والے انسانوں کی جسامت بکریوں سے بھی چھوٹی نظر آنے لگی! عمارت کے ہر حصہ میں ایک پوپ کا مجسمہ اور ایک خوب صورت یادگار نصب ہے۔ اور نیچے تہ خانوں میں اُن "جانشینان مسیح" کی لاشوں کے بکس رکھے ہوتے ہیں! بہت سے اسقف اور راہب جو دُنیا کے ہر گوشہ سے روما آتے تھے۔ (مورخ نے اُس عہد کے متعلق کہا تھا۔ کہ دُنیا کی ہر سڑک روم کی طرف آتی ہے!) اور یہاں کی خونریزی میں اپنا خون ملا دیتے تھے۔ وہ سب ہی ان ہی تہ خانوں میں سرداران مذہب کے پہلو بہ پہلو پڑے ہیں!

صدر عمارت میں شامیانہ کے پاس دیوار میں ایک فاختہ کی تصویر چسپاں ہے۔ یہ فاختہ مسیحیت کی اصطلاح میں "مقدس فاختہ" کہی جاتی ہے۔

سیاسی اصطلاح میں میں اسکو "امن کی فاختہ" کہتا ہوں۔ یہ وہی امن کی فاختہ ہے۔ جو کبھی مسیحی دُنیا میں امن قائم نہ رکھ سکی! جنہوں نے سب سے پہلے اس مقدس فاختہ کا گھونسلا سینٹ پیٹرس میں بنایا۔ ان کے ہاتھ بھی کہنیوں تک خون میں رنگے رہتے تھے۔ میں جب اُس عمارت کی بے مثل صناعیوں کو دیکھتا تھا۔ تو میرا خیال بار بار اُس فاختہ کی طرف جاتا تھا۔ کاش کہ جناب پاپا اُس کا پنجرہ لئے ہوئے روم میں نہ بیٹھے ہوتے۔ بلکہ اُس کو لیکر ایک دفعہ بلجیم اور فرانس کے ان میدانوں میں بھی آتے جہاں لاکھوں انسانوں کی ہڈیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں! مگر غریب فاختہ تو عہد قدیم میں خود اپنے گھر کے اندر امن قائم نہ رکھ سکی۔ اس عہد کے گناہ گار اس کے پروں کے سایہ کے نیچے کیونکر پہنچتے! اب تو پاپا بھی خود کبھی سال دو سال ہی میں اس عبادت گاہ کے اندر آتے ہیں۔ اور آتے بھی ہیں تو خفیہ سرنگوں کے ذریعہ سے!

وٹیکن سینٹ پیٹرس کی سیر کرتے ہوئے ہم پاپا کے روما کے ایوان کی طرف جا نکلے۔ اور معاً یہ معلوم ہُوا۔ کہ آج سے دو ہزار برس پہلے کوئی شہر آباد تھا۔ جس میں ہم آج چل پھر رہے ہیں۔ مجھے یہ ادا بہت پسند آئی۔ کہ پوپ نے اپنے گرد و پیش اپنے عہد جاہ و اقبال کی یاد کو ہر طرح تازہ رکھا ہے۔ وہی چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی دیواریں۔ وہی پُرانی قسم کے دروازے اور راستے سڑکوں پر وہی اینٹوں کا فرش۔ سوائے ایک چیز کے کہ عمارت کے اندر بجلی کے تار لگے ہوئے ہیں۔ کوئی چیز جدید نہیں حتیٰ کہ پوپ کی مختصر فوج کے سپاہی جو دروازوں پر پہرا دے رہے تھے۔ وہی عہد قدیم کی رنگین وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ اس زمانہ کی گاڑیاں

لہ عہد جدید کی سیاسی اصطلاح میں فاختہ صلح اور امن کا نشان تصور کی جاتی ہے۔

اور موٹریں جو اندر صحن میں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ کہ گویا کسی تصویر پر بدنما دھبے ڈال دیئے گئے ہوں۔ اُس سارے منظر سے یہ چیزیں جدا اور بے تعلق معلوم ہوتی تھیں۔ پاپائے اعظم کی صورت نہ دیکھ سکا۔ لیکن اگر چاہتا تو دیکھنا مشکل نہ تھا۔ اس لئے کہ جو شخص چاہے ملاقات کی درخواست کر سکتا ہے۔ خود پوپ اپنے محل سے باہر کبھی نہیں جاتے سوائے ایک پائیں باغ کے جس میں کبھی کبھی ان کا ہوا وار نظر آتا ہے۔ شہر روم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اور ان کے محلّہ سے سلطنت اٹلی کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ گویا موجودہ دارالسلطنت کے اندر ایک چھوٹی سی خودمختار ریاست ہے۔ جس کے سیاہ سپید کا اختیار پاپا کے سوا کسی کو نہیں۔ یہ داستان بھی بہت دلچسپ ہے۔ اور اگر موقع ہوتا تو میں اس زمانہ میں اسکی کچھ تفصیل بیان کرتا ہے۔ عہد جدید میں "نان کواپریشن" کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔ پاپا نے جو کبھی ساری مقدس سلطنت روم کے مالک و مختار تھے اب اپنی ذات کو ایک محلّہ کے اندر نظر بند کر لیا ہے۔ اور ہر پوپ معہ اپنے تمام عہدہ داروں اور درباریوں کے سینٹ پیٹرس کی مسند پر عہد کرتا ہے۔ کہ وہ کبھی اور کسی حال میں غاصب شاہ اٹلی کی حکومت کو قبول نہ کرے گا جتنی کہ اس دربار کے نزدیک سلطنت اٹلی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جو کچھ ہے پوپ ہے! شاہ اٹلی کی سلطنت کتنی ہی وسیع اور طاقتور ہو گویا کہ یہاں اس کو کوئی نہیں جانتا!

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!

قدیم مسیحیت کا یہ ٹوٹا ہوا مینار ابھی تک اپنا سر اُٹھائے کھڑا ہے۔ اور اس کے گرد و پیش ایک نئی دُنیا آباد ہے۔ جب پر وہ نفرت کے ساتھ نظر

کرتا ہے۔ جو اس کی طرف حقارت سے دیکھتی ہے۔ اور کبھی کبھی اس کے دامن عبا پر گستاخانہ ہاتھ بھی ڈال دیتی ہے!

جناب پاپا جنگل کے اس مور کی طرح ہیں جو ناچا۔ اور کسی نے اس کو نہ دیکھا۔ سارے مراسم و مشاغل شاہانہ اسی چار دیواری کے اندر جاری رہتے ہیں۔ اور چاہے وہ چند ہی ہوں۔ مگر اپنے دربار کے درباری وہی ڈراما کھیلتے رہتے ہیں۔ جو کبھی اس طرح کھیلا گیا تھا۔ کہ دُنیا گونج اُٹھی تھی۔ گو اس تھیٹر کے پردے اب بوسیدہ اور بے رنگ ہو گئے ہیں۔ ایکٹر بھی وہ نہ رہے اور جو ہیں۔ وہ از کار رفتہ ہیں۔ لباس اور سامان ارائش بھی پُرانا ہو گیا۔ لیکن بُرا بھلا تماشہ جاری ہے۔ پاپائے روما کی یہ وضعداری مجھے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ محل کے جو حصے دیکھے جا سکتے تھے۔ ان کو ہم نے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ لیکن وقت کم تھا۔ اور ان ہزاروں آثار قدیمہ کو دیکھنا تھا۔ جن کا دامن ساری دنیا کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے! البتہ ایک چیز کا اور ذکر کر دوں۔ ہم نے سینٹ پیٹرس میں جو تصویریں لگی ہوئی دیکھیں۔ ان سب کو قلمی تصور کیا۔ بعد کو معلوم ہُوا۔ کہ وہ سب رنگین پتھروں سے بنائی جاتی ہیں۔ اس صناعی کو موزیک کہتے ہیں۔ اور اس کا بہت بڑا کارخانہ خود پوپ کے محل میں ہے۔ جس کو ہم نے اچھی طرح دیکھا۔ درحقیقت حیرت انگیز صناعی ہے۔ معمولی الفاظ میں سمجھانا مشکل ہے کہ پتھر کے ٹکروں سے تصویریں اور ایسی خوب صورت تصویریں۔ کہ من و عن قلمی معلوم ہوں۔ کیونکر بنائی جا سکتی ہیں۔ ہم نے دیکھا۔ وہ صناع اس چابکدستی سے اُن تصاویر کو تیار کرتے تھے۔ کہ اٹلی کے بہترین مصور کی تصویر کو بجنسہٖ نقل کر لیتے تھے ہزاروں مختلف رنگ کے پتھر کے ٹکڑے ان کے سامنے رکھے ہوتے ہیں۔ اور

ایک چوکھٹے میں کوئی چپکانے والا مسالہ بھرا ہوتا ہے صناع ان ٹکڑوں کو اُٹھاتا ہے۔ اور اس چوکھٹے میں چپکا دیتا ہے۔ رنگوں کی آمیزش اس خوبی سے کرتا ہے۔ کہ وہ ٹکڑے ملتے چلے جاتے ہیں۔ اور تصویر کا صحیح نقشہ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ ٹکڑے غلط لگ جائیں۔ یا تصویر کی رنگ آمیزی ناقص ہو جائے +

کلوزیم

قدیم مسیحیت کے اس دارالسلطنت سے نکل کر ہم کلوزیم دیکھنے گئے کلوزیم کیا ہے۔ آؤ آج سے ایک ہزار آٹھ سو چالیس برس پہلے جو دُنیا آباد تھی۔ گھڑی بھر کے لئے وہاں بھی چلیں۔ اور دیکھیں کہ شہنشاہ ٹیٹس کے دارالسلطنت میں کیا ہو رہا ہے ؟ کلوزیم کی سیکڑوں سیڑھیوں پر اندر کی طرف نشست کی ایک جگہ بھی خالی نہیں۔ وسط میں سب سے بلند شہنشاہ روما اپنے تخت پر ریشم کے شامیانہ کے نیچے متمکن ہے۔ قرمزی رنگ کا ایک لباس جسم پر ہے۔ اور دبدبہ و طنطنۂ قیصری کا یہ عالم ہے۔ کہ سلطنت کا بڑا سا بڑا سردار بھی تخت شاہی کے قریب آنے کی جرأت نہیں رکھتا۔ نیچے کی سیڑھی پر روم کی "کنواریاں" بیٹھی ہوئی ہیں جنہیں سے ہر ایک سلطنت روما کے لئے ایک ستارۂ سعادت ہے! شہنشاہ کے بعد تمام سرداران مملکت پر افضلیت ان ہی کو حاصل ہے۔ سن رسیدہ "کنواریاں" جنہوں نے اپنی عمر میں بہت سے تماشے دیکھے ہیں۔ خاموش اور سنجیدہ ہیں۔ لیکن ان میں سے نوجوان لڑکیاں۔ جن کو اس قوم کی توہم پرستی نے عمر بھر کے لئے دنیا سے جُدا کر دیا ہے۔ جُھکی ہوئی اُس خونخوار تماشہ کو دیکھ رہی ہیں۔ جو رومن قوم کا قومی کھیل ہے! ان کا سانس کسقدر جلد جلد آرہا ہے۔ ذرا دیکھنا ان کے چہروں کی رنگت کیوں بدل رہی ہے۔ وہ دیکھو نیچے اکھاڑے میں اُس نوجوان کا پاؤں پھسل

گیا۔ جو ابھی ابھی شیر ببر پر تلوار کھینچ کر جھپٹا تھا۔ خون کی کیچڑ اتنی ہے۔ کہ پاؤں کا جمانا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ لو اس خونخوار جنگلی بھینسے کی پیٹھ پر ایک دوشیزہ زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہے۔ اور وہ بھینسا اب اُس سورما کی جانب آرہا ہے جس کے ہاتھ میں ایک تیغہ ہے۔ دیکھا؟ اس بھینسے کے سینگ نے پہلوان کے سینہ میں شگاف کر دیا۔ اور اسکی خون آلودہ لاش کو روندتا ہُوا گزر گیا۔ نوجوان "کنواری" گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتی ہے۔ دل میں کہتی ہے۔ ہائے کیا اس زنجیروں سے جکڑی ہوئی دوشیزہ کو کوئی نہ بچا سکے گا۔ کیا رومن قوم کا کوئی سورما بھینسے کی خونخواری کا مقابلہ نہ کر سکے گا!...... ان کنواریوں کی نشست سے نیچے روما کے معمر سردار اور منصب دار اپنی ٹھوڑیوں کو تلواروں کے دستوں پر رکھے ہوئے "تماشہ" دیکھ رہے ہیں۔ ان کے بعد نیچے کی صفوں میں دارالسلطنت کے ہزاروں شہری صف در صف بیٹھے ہیں۔ اکھاڑے میں خوفناک درندے بڑے بڑے نوجوان پہلوانوں کو چیر رہے ہیں۔ اور چبا رہے ہیں۔ جو سورما اپنی تلوار چمکاتا ہُوا گیا تھا۔ ابھی درندوں کے تیز پنجوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے! اور ہر کھلاڑی جب اس طرح شکار ہوتا ہے۔ تو احسنت و مرحبا کی ۸۰ ہزار آوازیں۔ نعرے اور چیخیں پیہم بلند ہوتی ہیں۔ سب سے آخر میں اس خونیں تماشے کا آخری منظر بھی دیکھ لیجے۔ ایک طرف سے اکھاڑے کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور چند۔ دس بیس پچیس نوجوان اور سن رسیدہ عورتیں اور مرد ہلکا اور بالکل سپید لباس پہنے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ معاً دوسرا دروازہ کھلتا ہے۔ اور دس بیس شیر۔ چیتے۔ مست جنگلی بھینسے اور ریچھ نمودار ہوتے ہیں۔ یہ تماشہ چند لمحہ کا ہنگامہ ہے۔ ایک دفعہ ہلاک ماری چند چیخوں کی آواز آئی۔ اور سناٹا ہو گیا۔ اب سوائے ان درندوں کے

غرّانے کے جن کے منہ سے گوشت کے ٹکڑے اور انسانوں کے ہاتھ پاؤں لٹکتے
نظر آتے ہیں۔ ہر طرف سکوت ہے۔ درندوں کو گرم لوہے کی سلاخوں سے
دروازے کی طرف ہٹایا جا رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ہٹتے جاتے ہیں۔ دیکھو نا
یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بڑے بڑے بلوں کے منہ میں چھوٹے چھوٹے سفید چوہے
ہیں۔ اور ان سے خون کی دھاریں گر رہی ہیں۔ آخر شکار ختم ہو گیا۔ دونوں
طرف کے دروازے بند ہو گئے۔ اور اب اکھاڑا خالی ہے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ
لو۔ پردے نہ پھٹ جائیں۔ روما کے ۸۰ ہزار بہادر شہری اس "تماشہ" کی داد
دے رہے ہیں! شہنشاہ اپنے غلام کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ اور غلام ادب
کے ساتھ ایک ہاتھ سینہ پر رکھ کر مئے ارغوانی کا جام لبریز پیش کرتا ہے۔ بہادر
شہنشاہ جام کو منہ سے لگاتا ہے۔ اور کچھ اس طرح مست ہو کر پیتا ہے۔ کہ
شراب کے چند قطرے اُس کے منہ سے بھی اُسی طرح گرتے ہیں جس طرح
شیروں کے منہ سے انسان کا خون ٹپک رہا تھا! تم پوچھتے ہو۔ یہ سب لوگ
کون تھے؟ جس کو شہنشاہ گیتی پناہ نے درندوں کے دسترخوان پر رکھوا دیا؟
میں ایک مورخ کی زبان سے جواب دیتا ہوں +

"یہ سب عیسائی تھے۔ جو مسیح کا پیغام لے کر روما میں آئے تھے!"

تماشہ دیکھ لیا۔ اب عالم خیال سے واپس آیئے۔ اور اینٹوں اور پتھروں
کی اُن سر بفلک دیواروں کو دیکھئے۔ جو روما کے اقبال اور بہادرانِ روما کے
سپاہیانہ (۱) مشاغل کی آخری یادگار ہیں! کلوزیم! اس نام سے رونگٹے
کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن فلسفی کہتا ہے۔ کہ کلوزیم کے تماشے دیکھنے والوں
کو گالیاں نہ دو! وہ تو اُس عہد کی یادگار تھے۔ جب انسانیت نے حیوانیت
کی حدود سے ذرا ہی قدم آگے رکھا تھا۔ جسم کے لمبے بال اور نوکدار ناخن باقی

نہ تھے۔ مگر طبائع کے اندر بہیمیت کے بہت سے عناصر ہنوز موجود تھے۔ اور اور کچھ کم سہی وہ عناصر موجود تو اب بھی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں۔ کہ ایسے انسان صورت درندے تو ایشیا میں بستے تھے۔ یورپ کے آباؤ اجداد کو اس حیوانیت سے کیا نسبت۔ وہ تو کچھ اور ہی ہوں گے جنکی اقبالمندی اور علو ہمتی کی قسم آج تک کھائی جاتی ہے!

عیسائیوں کو ناز ہے۔ کہ انہوں نے مذہب کی خاطر کیسی کیسی سختیاں جھیلی ہیں! اور آخر ساری دُنیا کو مہذب بنادیا! لیکن آج اگر پاپائے روما کلوزیم میں بے قصور عیسائیوں کے درندوں کے سامنے جانے کا ذکر فرمائیں تو میں عرض کروں۔ کہ عیسائیت کے بہترین زمانہ میں اسپین کی عدالت احتساب غیر عیسائیوں کے لئے درندوں کی بجائے آگ سے کام لیتی تھی۔ اتنا ہی تو فرق ہے!

عہد قدیم کے اقبالمند ان مہذب طریقوں سے واقف ہی نہ تھے۔ جو اب استعمال کئے جاتے ہیں۔ نہ ان غیر مہذب فدایان مسیح کے پاس وہ جدید آلات عقوبت تھے۔ جو بعد کو دُنیا کی تہذیب جدیدہ نے پیدا کئے!

شہنشاہ فلیویس ویسپا سیانو نے ۷۲ء میں کلوزیم کی بنیاد ڈالی۔ تاکہ اس کو دربار اور اہل روما کے لئے تفریح کی ایک عمارت عامہ قرار دیا جائے اور اس زمانہ کی انسانیت کے معیار کے مطابق اس میں سپاہیانہ کھیل تماشے اور بہادری و جرأت کے مظاہرے ہوا کریں۔ ۸۰ء میں شہنشاہ ویسپا سیانو کے بیٹے ٹیٹس نے اس عمارت کا افتتاح کیا۔ تقریب افتتاح اس طرح منائی گئی کہ تقریباً ۵ ہزار جنگلی درندے اکھاڑے میں چھوڑے

گئے۔ اور ہزاروں سورما (جن کو اس زمانہ کی اصطلاح میں گلیڈیٹرز کہا کرتے تھے۔ (Gladiators.) اُن درندوں سے دست بدست مقابلہ کرنے کے لئے اندر داخل ہوئے۔ پھر جو "تماشہ" اہل روما نے دیکھا۔ وہ اندازہ تخیل سے باہر ہے! ہزاروں درندے ہزاروں انسانوں کو لپٹے ہوئے تھے۔ ان کی تلواریں ان کے جسم میں اور ان کے پنجے انکی کھال میں پیوست تھے۔ گوشت کے پرزے اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔ اور خون کے فوارے تماشائیوں کی صف اوّل تک پہنچتے تھے۔ ہزاروں انسان اور درندے اس طرح فنا ہوئے۔ کہ لاشیں بھی پہچانی نہ جاتی تھیں! بہادر اہل روما کی تماشہ گاہ کا افتتاح یوں عمل میں آیا!

عمارت ایک سو ستر گز بلند ہے۔ اور اس کا محیط ۵۰۰ گز ہے۔ دیواروں کا نیچے کا ایک حصّہ ابھی تک محفوظ ہے۔ اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے ایک چھوٹے سے حصّہ کو اسی طرح درست کر دیا ہے۔ جس طرح کہ ان کے خیال میں وہ شہنشاہ ٹیٹس اور اس کے جانشینوں کے عہد میں تھا۔

رومی حمام

مہذب رومن شہری جب کلوزیم کے تماشوں سے سیر ہو جاتا تھا۔ تو اپنا وقت ان حماموں میں صرف کرتا تھا۔ جن کے نام سے آج تک یورپ کے بہترین حمام منسوب کئے جاتے ہیں لیکن ان حماموں کے آثار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ دولت و سطوت و نفس پرستی کے اس عہد جدید میں حمام کی وہ عظیم الشان عمارتیں خواب و خیال سے باہر ہیں۔ اور لندن و پیرس کے جو حمام ہم دیکھتے ہیں وہ تو روما کے قدیم حماموں کے مقابلہ میں محض کھلونا ہیں۔ روم میں یوں تو بہتر سے بہتر حمام موجود تھے۔ لیکن کَرا کلا کا حمام عامۃ الناس کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ جس میں ۱۳ ہزار

آدمی روزانہ اور اکثر بہ یک وقت غسل کرتے تھے۔ ناشتہ ہر شخص کو مفت ملتا تھا! سیکڑوں سنگ مرمر کے ستون۔ متعدد بڑے بڑے حوض گرم پانی کے نل۔ سنگ مرمر کے فرش کی بے مثال پچہ کاری۔ بیٹھنے کے لئے کرسیاں چبوترے جن پر لیٹ کر خوشبوئیں ملوائی جاتی تھیں۔ وسیع برآمدے جہاں ناشتہ کیا جاتا تھا۔ یعنی جب وہ حمام اپنی پوری آرائش کے ساتھ آباد ہوگا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ہر کمرہ دیوان عام اور دیوان خاص سے وسعت اور خوب صورتی میں کسی طرح کم نہ ہوگا۔ اور کہنے کو کچھ بھی نہ تھا اہل روما کا محض حمام تھا! قیمتی پتھروں کے نہانے کے حوض اور "ٹب" اور طشت آج تک پاپائے روما کے عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان قیمتی پتھروں کے اتنے بڑے ٹکڑے کہاں سے آئے کہ ایک رومی کی پوری جسامت کے قابل غسل کرنے کا حوض ایک ایک ٹکڑے میں سالم بنا لیا گیا۔ عہد قدیم کی اِن عجائبات کو دیکھئے اور حیران رہ جایئے!

میں چاہتا تھا۔ کہ روما کے آثار قدیمہ کی دلچسپ داستان کو اسی طرح تفصیل کے ساتھ جاری رکھوں۔ لیکن نہ ہو سکا۔ دو سال سے زیادہ ہوگیا مسودہ پڑا ہوا ہے۔ اور احباب کے تقاضے ہیں۔ کہ مکمل یا غیر مکمل جو کچھ بھی ہو کسی طرح چھپ جائے۔ میں بھی اب کچھ اُکتا گیا ہوں۔ اس لئے بقیہ داستان مختصر کرتا ہوں:۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے قدیم روما کو خوب دیکھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا دسواں حصّہ بھی نہ دیکھ سکا اور قدرے قلیل جو کچھ دیکھا۔ اس کا

عشر عشیر بھی ان صفحات پر نہ لا سکا۔
کلوزیم کا مدمقابل فورم کا عظیم الشان کھنڈر ہے۔ میں نے غلط کہا۔ وہ کھنڈر کھنڈر نہیں ہے۔ ایک عظیم الشان آبادی ہے! خالی انسان کا گوشت و پوست اُن ٹوٹی دیواروں اور شکستہ محرابوں میں متحرک نظر نہ آئے۔ لیکن تصور انسانی کا غیر فانی حصہ آج بھی اُن مٹی اور پتھر اور اینٹوں کے ڈھیر میں زندہ موجود ہے! جولیس سیزر اور اس کے قاتل کے تمام نقوش زندہ ہیں۔ روم کی مقدس کنواریاں بھی اپنے گھروں کی چاردیواری میں زندہ موجود ہیں۔ اس راستہ کے نشانات بھی زندہ ہیں۔ جس پر روما کے تاجدار گزرا کرتے تھے۔ اور اُس کے وہ تاجدار بھی زندہ ہیں۔ اگر ان سب کو مردہ کہتے ہو تو پھر یقین جانو کہ تمہیں زندگی کے معنے معلوم نہیں! خاک کی ڈھیریوں اور قبروں کے کتبوں کی جانب کیا دیکھتے ہو۔ نہ زندگی ماں کی گود میں ہے نہ موت قبر میں! ماں کی گود سے الگ ایک زندگی ہے۔ وہی اصلی زندگی ہے۔ قبر سے دور ایک موت ہے۔ وہی موت ہے!
قدیم روما کے سورماؤں اور تاجداروں کو جتنا چاہو بُرا کہو مگر ان کے زندہ ہونے سے انکار نہیں کر سکتے۔ ان گرے ہوئے میناروں۔ ٹوٹے ہوئے ستونوں اور جھکی ہوئی دیواروں سے پوچھو وہ گواہی دیں گی۔ کہ ہمارے سامنے جولیس سیزر کے سینہ میں چھری ماری گئی تھی۔ مگر وہ مرا نہیں۔ ہمارے سامنے بروٹس مارا گیا تھا۔ مگر وہ مرا نہیں۔ ہم نے دیکھا انٹونی سیزر کی لاش کا مُنہ کھول کھول کر دکھا رہا تھا۔ لیکن سیزر ہمارے پاس کھڑا ہنس رہا تھا! ہم زندہ ہیں اور ہمارے پاس جو کچھ ہے۔ سب زندہ ہے! ظالم بھی اور مظلوم حسن بھی اور عشق بھی۔ سورما بھی جس نے برچھوں اور تلواروں کے زخم کھائے

اور وہ یونانی غلام بھی جو کلوزیم میں خونخوار درندوں کے سامنے ڈالے گئے۔ وہ لڑکی بھی زندہ ہے۔ جس کی عصمت چھینی گئی۔ اور تارکوین بھی!
اس تغیر حیات۔ اس ہنگامۂ زندگی کی تصویریں میں ان صفحات پر کیونکر کھینچوں! ایک ہفتہ کے مختصر قیام میں دن دن بھر ان کھنڈروں میں مارا پھرتا تھا۔ پھر بھی مجھے اعتراف ہے۔ کہ قدیم روما سے ذرا بھی واقف نہیں! بس اس داستان کو یوں ہی چھوڑ دیجئے!

روما میں ترک احباب کا ایک اچھا اجتماع ہے۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ پیرس اور روما دو ہی مقامات ہیں۔ جو اس وقت یورپ میں انگورا کی سیاسی دردبست کا مرکز ہیں۔ ایک حیثیت سے روما۔ پیرس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ فرانس بہ نسبت اٹلی کے برطانیہ کی پالیسی کے خلاف جانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ مگر اٹلی چونکہ یونان کے ساتھ ایک قدیم عداوت رکھتا ہے۔ اس لئے موجودہ کشمکش میں خواہ برطانیہ کی پالیسی کچھ ہو۔ وہ کسی طرح یونان کی پیش قدمی کو پسند نہیں کرتا اور غالباً یہ سچ ہے۔ کہ اٹلی سے انگورا کو معتدبہ امداد بھی ملتی رہی ہے۔ سامان جنگ کے اناطولیہ پہنچنے کا یہی ایک راستہ ہے اس لئے ترک بھی اٹلی کی دوستی کو بہت قابل قدر سمجھتے ہیں۔ علاوہ بریں۔ روما میں انگورا کے نمایندوں نے اپنا کافی اثر قائم کر لیا ہے۔ اور ہم نے دیکھا کہ اٹلی کی خارجی پالیسی میں ترک خاصہ حصہ لے رہے ہیں۔ یورپین اقوام کی دوستی کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہوتی۔ اس لئے اس پر بھروسہ کرنا یا کوئی خوشگوار پیشین گوئی کرنا مناسب نہیں۔ لیکن اگر افواہیں بے حقیقت نہیں تو اُمید کی جاتی ہے۔ کہ شاید بہت جلد انگورا اور اٹلی کے درمیان کوئی ایسا

معاہدہ ہو جائے گا۔ جو اتحادیوں کے نام نہاد اتحاد کو بیحد صدمہ پہنچائیگا۔

ہز ایکسلنسی جامی بے جو وہاں حکومت انگورا کے نمایندے ہیں۔ ایک بہت ہی ذکی اور ہوشمند مدبر معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت تک جتنے ترک احباب سے ملاقات ہوئی۔ ان میں بلحاظ تدبر و معاملہ فہمی جامی بے سب سے زیادہ سمجھدار اور زیرک معلوم ہوتے ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ وہ انگریزی نہیں جانتے اس لئے ان سے جب کبھی گفتگو ہوئی ترجمان کے ذریعہ سے ہوئی۔ مگر روم میں سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت عبدالحمید سعید بے کی دیکھی۔ عجیب و غریب انسان ہیں۔ ان کو دیکھتا تھا۔ اور شوکت بھائی یاد آتے تھے۔ بلحاظ جسم و جثبہ کے شوکت بھائی سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ قد میں بھی۔ وزن میں بھی۔ اور ہاتھ پاؤں میں بھی۔ شاید وہ موہنی اور وہ دلکش شخصیت تو نہ ہو۔ مگر باقی ہر حیثیت سے عبدالحمید سعید بے شوکت بھائی کی ہو بہو تصویر ہیں۔ داڑھی بھی وہی ہے۔ گو تھوڑی ہے۔ حالت جوش میں وارفتگی بھی وہی ہے۔ آنکھوں کی چمک بھی وہی ہے۔ البتہ زبان کی تیزی ویسی نہیں۔ آہستہ بولتے ہیں۔ یا شاید ہماری وجہ سے (چونکہ ہم انکی زبان سے ناواقف تھے) آہستہ بولتے ہوں۔ صاحب موصوف ایک سپاہی منش رومی ہیں۔ کئی لڑائیوں میں شریک ہو چکے ہیں۔ جسم پر بہت سے زخموں کے نشانات ہیں اور جب کبھی اپنی اُس سپاہیانہ زندگی کے واقعات سنانے شروع کر دیتے ہیں۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ شخص خون پیتا ہوگا۔ اور خون کھاتا ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ یہ دیو صورت اور فرشتہ سیرت انسان اسلامی شجاعت اور عصبیت کی ایک عجیب دل آویز تصویر ہے۔ میرا ان کا عجیب معاملہ رہا۔ وہ انگریزی نہیں بول سکتے تھے۔ اور میں نہ فرانسیسی بول سکتا۔ نہ عربی۔ لیکن جی چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح ان سے باتیں ہوں۔

آخر گونگے بہروں کے اشاروں سے آغاز کار ہوا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اسقدر جلد اشارے ہونے لگے۔ کہ باتوں کے دریا بہ گئے۔ انکا یا میرا اشارہ اتنی داستان بیان کر دیتا تھا۔ جو شاید پندرہ منٹ کے مسلسل تکلم کے بعد ادا ہو سکتی۔ اشاروں ہی اشاروں میں دونوں طرف سے حال دل بیان ہو گیا۔ میں تو صاحب موصوف سے شوکت بھائی کی کشتی بھی بد آیا ہوں۔ اور کہہ آیا ہوں کہ جب دونوں صاحبان کو خدا کبھی بخیر و خوبی ملائیگا۔ اور تمام بدنصیبوں کے بھلے دن آئیں گے۔ تو عبد الحمید سعید بے اور مولانا شوکت علی صاحب کی ایک کشتی بڑے اہتمام کے ساتھ ہوگی! خدا ان کو اپنی امان میں رکھے۔ اسلام کے کیسے کیسے جواہر ریزے ہیں۔ جو آج وادی غربت میں وطن سے دُور مارے پھر رہے ہیں۔ اور پھر بھی اپنی دھن کے پکے ہیں! یہ مجاہدوں کی قوم خود زندہ رہیگی۔ اور دوسروں کو زندہ رکھے گی۔ انشا اللہ!

ایک دن ہز ایکسلنسی کے یہاں پرنس سعید حلیم پاشا (سابق وزیر اعظم دولت عثمانیہ) کی صاحبزادی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے والد ماجد کا انتظار کر رہی تھیں۔ جنکے جلد رہا ہو کر مالٹا سے رُوما آنے کی اُمید تھی۔ ہم لوگوں کی روانگی کے چند روز بعد صاحب موصوف مالٹا سے رہا ہوئے۔ روم آئے اور وہاں کسی دشمن اسلام کی گولی کا نشانہ ہو کر شہید ہو گئے۔ مجھے اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر انکی صاحبزادی یاد آئیں۔ جو اس دن کسقدر شوق اور محبت سے اپنے والد ماجد کی رہائی کا بار بار ذکر کرتی تھیں!

ایک ہفتہ بعد ہم رُوما سے روانہ ہوگئے ٭

پھر چند روز فرانس میں

قمار خانہ یورپ

جس جہاز میں ہم کو مارسیلز سے روانہ ہونا تھا۔ اسکی روانگی قریب تھی۔ اس لئے چند مقامات کو چھوڑ کر جنکے دیکھنے کا پہلے ارادہ تھا۔ ہم سیدھے مارسیلز کی طرف چل دیئے۔ راستہ میں تھوڑا وقت ملا تو فرانس کے دو مشہور مقامات کو دیکھ لیا۔ شہر نیس بحر اوقیانوس کے ساحل پر واقع ہے۔ اور یورپ کے دولتمند اور سیاح سمندر کی آب و ہوا سے متمتع ہونے کے لئے یہاں بکثرت آتے ہیں۔ چھوٹا سا شہر ہے۔ مگر آخر ہے تو فرانس! فرانس ہر حال میں فرانس ہے۔ غریب اور امیر بڑے اور چھوٹے۔ وہ ایک خاص ادا رکھتے ہیں۔ جو فرانس ہی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اور بلا شرکت غیرے فرانس والوں ہی کا حصہ ہے۔ واہ رے فرانس تیری رعنائی اور کج کلاہی تیرے ہی لئے ہے۔ اور تیرا تخیل رندانہ بھی صرف تیرا ہی ہے۔ مجھ سے کسی نے کہا۔ کہ زمانہ جنگ میں جب تک کہ جرمن توپوں کے گولے شہر پیرس کے اندر نہ گرنے لگے۔ اس وقت تک زندگی کی رنگینیاں اور محفل آرائیاں حسب دستور باقی تھیں۔ پھر جب جرمنوں کی گولہ باری کے باعث شب کو شہر میں اندھیرا رہتا تھا۔ تب بھی مکانوں کے اندر اور تہ خانوں میں فکر و تردد کا دیو کسی نہ کسی طرح قتل کیا جاتا تھا!

نیس کی خصوصیت اسکی آب و ہوا ہے۔ البتہ نیس سے چند میل کے فاصلہ پر ایک اور چیز ہے۔ جو ساری دنیا کے بے فکروں اور عیش پرستوں کا مرجع

اور مرکز ہے۔ لب سمندر پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹی سی مگر بیحد خوب صورت بستی ہے۔ جس کا نام مانٹی کارلو ہے۔ اسکی خصوصیت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ ساری دنیا کے جواری جوا کھیلنے مانٹی کارلو آتے ہیں۔ اور ہر روز صبح سے شام تک اس چھوٹی سی بستی میں دوچار لکھ پتی مفلس اور محتاج ہو جاتے ہیں۔ اور دوچار مفلس اور محتاج لکھ پتی! صورت یہ ہے۔ کہ مانٹی کارلو کی میونسپلٹی نے بہت بڑے سرمایہ سے ایک قمار خانہ قایم کیا ہے۔ جسکی آمدنی سے خود میونسپلٹی کا کاروبار چلتا ہے۔ صبح دس بجے سے رات کے ۱۱ بجے تک اس عالی شان عمارت کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ جس کا جی چاہے ٹکٹ لے کر اندر چلا جائے۔ بہت وسیع عمارت ہے۔ بڑے بڑے کمروں میں میزیں سجی ہوئی ہیں۔ سیکڑوں مرد اور عورتیں بازیاں ہار رہے ہیں۔ اور جیت رہے ہیں۔ تمام کمروں میں ایک سکوت مزار طاری ہے۔ سوائے جلد اور آہستہ چلنے والے سانس کے کسی چیز کی آواز نہیں آتی۔ نظریں میز پر جھکی ہوئی پنسل ہاتھ میں ہے۔ کاغذ کے پرزے پر اپنی ہار اور جیت کا حساب لگایا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی دو، کونوں میں کچھ سرگوشیاں ہو جاتی ہیں۔ میز پر ایک گھومنے والا چکر لگا ہوا ہے۔ جس پر نمبر کندہ ہیں۔ بازی لگانے والے ان نمبروں پر بازی لگاتے ہیں۔ ایک اہلکار اس چکر کو گھماتا ہے۔ جس نمبر پر وہ چکر رکتا ہے۔ اس نمبر پر روپیہ لگانے والے میز پر رکھے ہوئے سکوں کو چاروں طرف سے بٹور کر اپنے سامنے دھیڑ لگا لیتے ہیں۔ ہر ہاتھ پر ۶ فرانک سے ۶ ہزار فرانک تک بازی لگانے کی اجازت ہے۔ یہ سارا کھیل کامل خاموشی کے ساتھ ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی مہینہ میں دو ایک دفعہ اس خاموشی کو برہم کرنے والے واقعات بھی پیش آتے ہیں۔ انکی نوعیت یہ ہوتی ہے۔ کہ دفعتاً ایک شخص اپنی ساری

پونجی ہار کر اٹھتا ہے۔ برابر کے کمرے میں جاتا ہے۔ اور اسی لمحہ ایک پستول
کے چلنے کی آواز آتی ہے۔ کھیلنے والے دم کے دم سر اُٹھاتے ہیں۔ مگر واقعہ
اس قدر معمولی ہے۔ کہ کوئی اپنی جگہ سے اُٹھ کر دیکھنے بھی نہیں جاتا۔ کھیل
جاری رہتا ہے۔ اور قمار خانہ کے ملازمین لاش کو کسی دوسرے دروازہ
سے اُٹھالے جاتے ہیں! مرنے والے کی کرسی پانچ منٹ بھی خالی نہیں
رہتی! جن لوگوں سے ابھی ابھی وہ بازیاں بد رہا تھا۔ انہیں یہ بھی خبر نہیں
ہوتی۔ کہ کیا ہُوا۔ وہاں تو زندگی صرف دو چیزوں سے وابستہ ہے۔ وہ ایک
کاغذ کا پرزہ جس پر نفع اور نقصان کا حساب لکھا جاتا ہے۔ اور سکّوں کی ڈھیری
جو سامنے ہوتی ہے۔ بس۔ اس کے سوا ہر چیز فروعات میں داخل ہے۔ موت
اور زندگی کے باقی جھگڑوں سے کسی قمار باز کو کوئی واسطہ نہیں! ہم نے دو
چار ہندوستانی (غالباً بنگالی تھے) بھائیوں کو بھی بازیاں لگاتے دیکھا۔ وہ بھی
اسی طرح منہمک تھے۔ جس طرح دوسرے حاضرین۔ ہوٹل میں معلوم ہوا۔ کہ
اکثر ہندوستانی یہاں جوا کھیلنے کے لئے آتے ہیں۔ یورپ کے تبرکات اور
معجزات سے یورپ کا ہندی نژاد شاگرد اپنے یورپین معاصرین سے کچھ کم
روشناس نہیں ہوتا! میں تو صرف چند گھنٹے وہاں ٹھہر سکا۔ ورنہ کیا معلوم
ہے کہ دو چار بازیاں میں نے بھی بدی ہوتیں! لیکن —— ہم تو ہاری ہوئی
بازی کھیل رہے ہیں۔ ہماری بازی مانٹی کارلو کے قمار خانہ میں نہیں لگی ہے۔
وہ تو لندن کے دفتر خارجہ میں بدی گئی ہے! کھیل قسمت کے ہاتھ ہے۔ ہندوستان
والوں نے تو اب اس بازی میں بہت کچھ لگا دیا۔ پانسہ کدھر پڑیگا خدا کو معلوم
ہے! ہم قسمت کے قمار باز ہیں۔ اور آج کل ہمارا مانٹی کارلو دیکھنا ہو تو ہندوستان
کے جیل خانوں کی گلگشت کیجیے!

مانٹی کارلو اور نیس سے ہم سیدھے مارسیلز پہنچے۔ اور دوسرے ہی دن وہاں سے جہاز پر سوار ہوگئے ✦

ختم کلام

داستان تمام ہوئی۔ وہ داستان ہی کیا تھی۔ صرف ایک غلط انداز نظر میں انسان کا دماغ آنکھوں کے ذریعہ سے اسقدر دیکھتا ہے۔ کہ اُسکی تفصیل اگر عمر بھر لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے۔ میں نے تو دنیا کا بڑا حصّہ ایک نظر دیکھ لیا۔ کیا کیا لکھتا اور کیونکر لکھتا! ابتدائی اوراق میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ میں نے مشرق کی نظر سے مغرب کو دیکھا۔ لوگ پوچھتے ہیں۔ کہ تو نے مغرب کو کہاں تک مشرق سے روشناس پایا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے۔ کہ میں نے قطب شمالی کو قطب جنوبی سے کے گز کے فاصلہ پر پایا۔ تو بتاتے۔ کہ کیا کہوں! روشناسی! یورپ کے عہد وسطےٰ میں جب مشرق کے لوگ غلام بنا کر یورپ میں لائے جاتے تھے۔ اس وقت ان غلاموں سے جو وقوف ان کے مالکوں کو ہوتا تھا وہی آج بھی ہے۔ اتنا تو جانتے ہیں۔ کہ یہ سانولے اور کالے رنگ کے انسان اُن ملکوں میں رہتے ہیں۔ جہاں ہماری تجارت اور حکومت بار آور ہوتی ہے۔ یہ کیا ہیں۔ یہ بھی انسان ہیں۔ یہ بھی دل و دماغ رکھتے ہیں۔ یہ بھی کسی تہذیب و تمدن کے وارث ہیں۔ ان کے گھر بھی کبھی چراغ جلتا تھا۔ یہ بھی دنیا پر حکومت کرنا جانتے ہیں۔ ان باتوں کو یورپ کا سرمایہ دار کچھ نہیں جانتا! سنتے تھے۔ کہ یورپ میں ایشیا کے فنون لطیفہ اور صناعیوں کی قدر کی جاتی ہے۔ وہاں بڑے بڑے عالی دماغ مستشرقین ہمارے حالات کی تحقیق

میں اپنی عمریں صرف کرتے ہیں۔ شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن میں تو سیکڑوں فرانسیسیوں اور دوسرے یورپین اصحاب سے ملا۔ پہلے سفر میں بھی اور دوبارہ اب جب کہ تجارت کے سلسلہ میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا اس کی چند مثالیں کافی ہیں:۔

پیرس میں جو لوگ اسلامی معاملات میں بہت دلچسپی لینے والے سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں ایک معمر بزرگ جو بہت دولتمند اور اپنے ملک کی حکومت میں بااثر شخصیت رکھنے والے ہیں۔ اکثر ملا کرتے تھے۔ ایک دن فرمانے لگے۔ کہ میں حیران ہوں۔ آپ لوگ غیر قوم کی حکومت کیوں گوارا کرتے ہیں۔ جبکہ اس قوم کا قبضہ محض ہندوستان کے سواحل پر ہے۔ آخر باقی ملک تو آزاد ہے۔ اسکی آبادی کیا کرتی ہے!!!

اب فرمایئے؟ یہ بزرگ اسلامی اور ایشیائی معاملات سے بہت واقف سمجھے جاتے ہیں!!!

ایک نوجوان رئیس زادہ سے ملاقات ہوئی جو کبھی کبھی اخبار نویسی بھی کرتے ہیں۔ ایک دن ارشاد ہوا۔ کہ "ہندوستان کتنا بڑا جزیرہ ہے۔ بہت بڑا ہوگا!"

ایک صاحب کو عرصہ تک یہ مغالطہ رہا۔ کہ ہم لوگ امریکہ کی طرف کے رہنے والے ہیں! ٹیونس کے ایک عنایت فرما اکثر آیا کرتے تھے۔ وہ بہ مشکل اس غلط فہمی سے نجات پا سکے۔ کہ ہندوستان میں نہ بڑے بڑے سرسبز پہاڑ ہیں۔ اور نہ وہاں ریل چلتی ہے! غرض کیا کہوں کیسے کیسے آشنا اور واقفکار ملے! اور سنیئے:۔

مجھے یہ شوق تھا۔ کہ جب کبھی کسی تھیئٹر یا متحرک تصویروں کے تماشے میں کسی ایشیائی داستان کے پیش کئے جانے کا اعلان ہوتا تھا تو میں اس کو دیکھنے ضرور جاتا تھا۔ یہ تو سب جانتے ہیں۔ کہ یورپ نے ڈراما اور تھیئٹر کے فنون میں

عجیب غریب ترقی کی ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے۔ کہ ہندوستان کے تھیٹروں کو یورپ کے تھیٹروں اور خصوصاً پیرس کی تماشہ گاہوں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ بلا مبالغہ ایک ایک تماشہ کی تیاری میں لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ اور برسوں تحقیق و تفتیش کے بعد کہیں ڈراما تیار کرتے ہیں۔ کتابوں اور تاریخوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ عمارات کو دیکھتے ہیں۔ لوگوں کے رسم و رواج کو سمجھتے ہیں۔ تب کہیں ڈراما اسٹیج پر لاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ایشیا کا تعلق ہے۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ایک دن سُنا کہ کسی تماشہ گاہ میں سلیمان و بلقیس کا تماشہ متحرک تصاویر میں دکھایا جائیگا۔ میں حسب عادت دیکھنے گیا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ کہ حضرت سلیمان کا ایک عظیم الشان دربار جما ہوا ہے۔ جس میں درباری عجیب عجیب قسم کے زرق برق لباس پہنے کھڑے ہیں۔ ایرانی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ اور فرانس کے شیشہ آلات لگے ہوئے ہیں۔ مکان ایسا ہے۔ جیسے کسی مغل بادشاہ ہندوستان کا محل۔ بلقیس تشریف لاتی ہیں۔ تو ان کا لباس یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی ابھی پیرس کی کسی بڑی دُکان سے تیار ہو کر آیا ہے۔ اونچی ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے ہیں۔ سر ننگا ہے۔ اور یورپین وضع کے مطابق سینہ بھی نیم برہنہ ہے۔ یہ بلقیس نہیں! بیٹھا ہُوا ان مشرق کے مصوروں کو کوس رہا۔ کہ کم بخت ہمارے حالات کے سمجھنے میں عمریں بسر کرتے ہیں۔ اور پھر بھی بلقیس کو اونچی ایڑی کا جوتا پہنا دیتے ہیں۔

ایک دوسرے تماشے میں جانے کا اتفاق ہُوا۔ یہاں ایک منظر دکھاتے ہیں۔ جس میں کسی اسلامی ملک کے رسم و رواج کا مرقعہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اس تماشہ میں کئی دفعہ نماز پڑھتے مسلمان دکھائے جاتے ہیں۔ یعنی اس طرح کہ کھڑے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف سیدھے کھڑے کئے (یہ گویا نیت باندھی)

فوراً زمین پر پٹ لیٹ گئے (اس میں رکوع و سجود سب شامل ہے) اور دامن جھاڑ کر کھڑے ہو گئے! اس کا نام نماز ہے۔ خدا سمجھے ان مدعیوں سے۔ جو مشرق سے اپنی واقفیت کے کیسے کیسے دعوے کرتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ ہماری زندگی کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ فرانس کی حکومت میں بہت مسلمان رعایا ہے۔ جس کے شہروں میں فرانسیسی حکام اور تاجر اپنی عمریں گزارتے ہیں۔ ہزاروں عرب فرانسیسی فوج میں ملازم ہیں۔ لیکن کسی فرانسیسی مشرق کو آج تک صحیح طور پر یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ نماز کس طرح ادا ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے۔ کہ یورپین اقوام غیر قوموں سے واقف ہونے کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں۔ وہ ہماری زندگی کے کسی ایک پہلو سے بھی آشنا نہیں ہو سکتیں۔ الا یہ کہ تجارتی اور صنعتی ترقی نے ان کو ہماری قسمتوں کا مالک بنا دیا ہے۔ اور ان کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ گورے رنگ کی اقوام کا فطری حق ہے۔ کہ وہ کالے رنگ کے لوگوں پر حکومت کریں۔ عہد جدید کی عالمگیر تحریک اسی عقیدہ کا نتیجہ اور اسی چیلنج کا جواب ہے۔ اور ان خود بینیوں کا یہی ایک جواب ہے۔ جو دیا جا سکتا ہے۔ اور دیا جانا چاہیئے۔
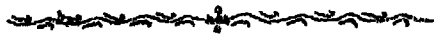
دارالاشاعت پنجاب لاہور ۱۸۹۸ء میں لاہور میں قائم ہُوا تھا۔ اور اس ۲۵ سال کے عرصے میں اس نے ملک کی تعلیمی خدمات اس خوبی سے سرانجام دی ہیں۔ کہ تمام ملک نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

دارالاشاعت مذکور نے ۱۸۹۸ء میں مستورات کیلئے ایک اُردو ہفتہ وار اخبار تہذیبِ نسواں جاری کیا جو اب تک مولوی سید ممتاز علی صاحب کی سرپرستی اور محترمہ آصف جہاں بیگم کی اڈیٹری میں جاری ہے۔ یہ اخبار تمام ہندوستان میں سب سے پہلا زنانہ ہفتہ وار اخبار ہے۔ اور اس نے ہندوستان کی مستورات کی تعلیم و ترقی اور بیداری میں بے انتہا قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ملک کی قابل و تعلیم یافتہ مستورات اور مرد اس میں نہایت مفید مضامین لکھتے ہیں۔ اور یہ اس احتیاط سے اڈٹ کیا جاتا ہے۔ کہ معزز شرفا اطمینان سے اس کو اپنی مستورات کے ہاتھوں میں جانے دیتے ہیں۔ اسکی سالانہ قیمت مع محصولڈاک صہ ہے۔ نمونہ مُفت۔

دارالاشاعت سے ننھے بچوں کیلئے ہفتہ وار اخبار پھول شایع ہوتا ہے۔ اس میں نہایت آسان و دلچسپ اور نصیحت خیز کہانیاں اخلاق کی درستی اور معلومات کے بڑھانے والے مضمون اور مزیدار نظمیں درج ہوتی ہیں اس کا خط بھی جلی ہے۔ کہ بچے آسانی سے پڑھ سکیں۔ اور اسکی مقبولیت اس سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ کہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کئی سالوں سے اسے ہزاروں کی تعداد میں خرید کر سرکاری سکولوں میں پہنچاتی ہے۔ اسکی سالانہ قیمت مع محصولڈاک صہ ہے نمونہ مُفت۔

دارالاشاعت پنجاب لاہور میں بچوں۔ لڑکوں۔ اور لڑکیوں۔ عورتوں اور مردوں کیلئے مفید اعلیٰ کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ فہرست کتب [illegible] اور کیٹلاگ [illegible] مفت طلب فرمائیے۔

دارالاشاعت پنجاب
۱۹۵ - ریلوے روڈ
لاہور

[illegible] میں باہتمام لالہ [illegible] پرنٹر چھپا۔ اور دارالاشاعت [illegible]